ہولناک سازش

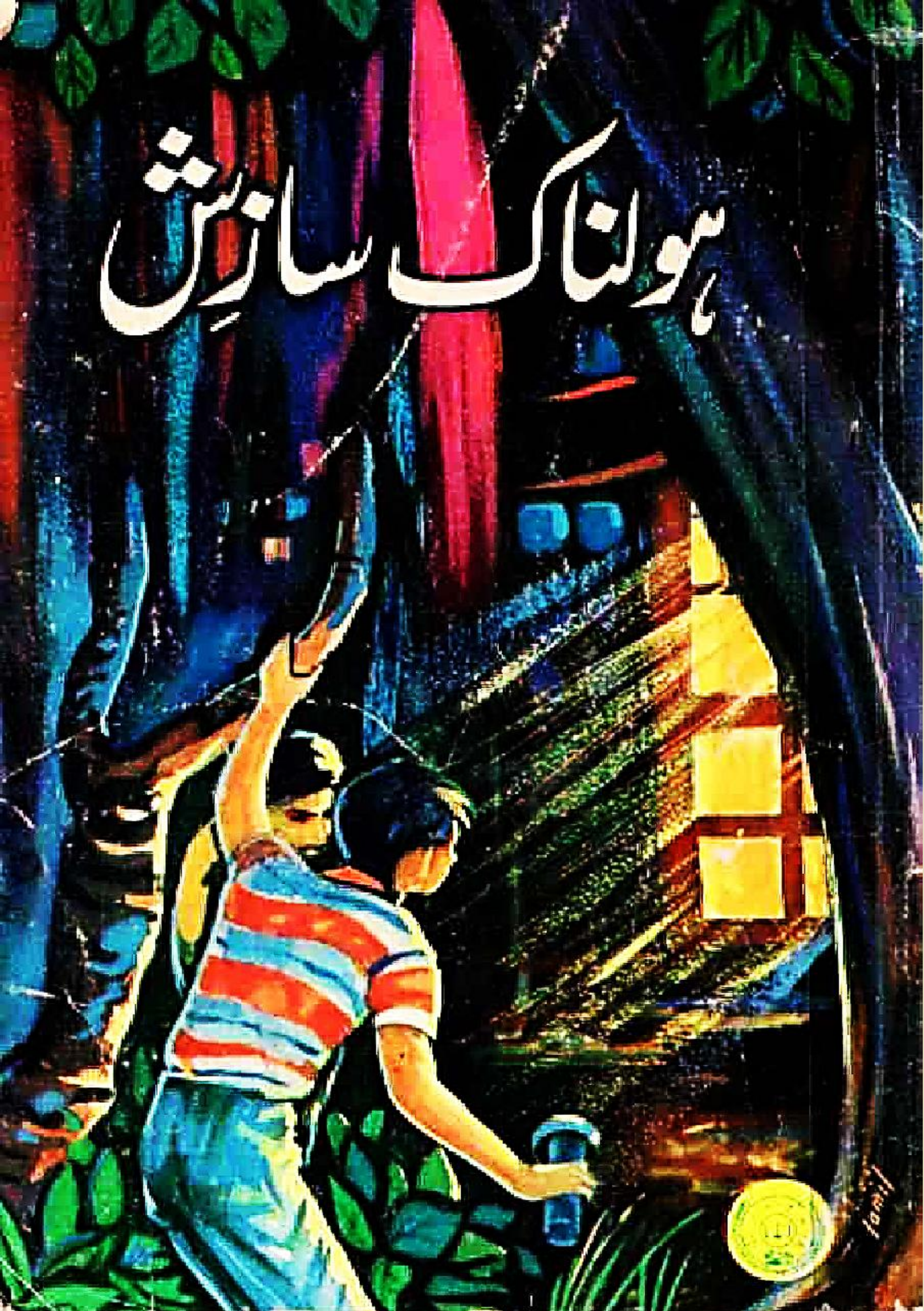

ہولناک سازِش

اختر رضوی

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

خطرناک مسئلہ

نیازی صاحب آج پھر کسی خطرناک معاملے سے دوچار نظر آ رہے تھے۔

کوئی دس منٹ ہوئے کہ چپراسی اُن کی میز پر چائے کا کپ رکھ گیا تھا۔ مگر وہ کاغذات میں اِس بُری طرح اُلجھے رہے کہ اُنہیں اُس کی طرف دیکھنے کی بھی مہلت نہ ملی۔

آخر ایک فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد جب اُنہوں نے چائے چُسکی لی تو وہ

بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ چپراسی کو دوبارہ گرم چائے لانے کا حُکم دیتے مگر ایک دوسرا فائل سامنے کھول کر وہ بالکل اسی طرح یہ ٹھنڈی چائے پینے لگے جیسے گرما گرم چائے پی جاتی ہے۔ اور یہ اِس بات کی علامت تھی کہ آج نیازی صاحب واقعی کسی غیر معمولی مسئلے سے دوچار ہیں۔

چائے کی پیالی ختم کرنے کے ساتھ ہی اُنھوں نے اطمینان سے آخری فائل کا آخری کاغذ بھی دیکھ ڈالا۔ اُسی لمحے اُنھوں نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گیارہ بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔ ایک گہرا سانس لے کر اُنھوں نے کُرسی کی پُشت سے ٹیک لگائی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کُچھ دیر آرام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے آگے بڑھ کر اُنھوں نے ٹیلیفون اُٹھالیا۔

"ماجد، بھئی ذرا ضیغم صاحب سے مِلاؤ۔" اُنہوں نے اپنے پی اے سے کہا تھا۔

"جی؟ بیگم صاحبہ سے؟" پی اے نے شاید صاف نہیں سُنا تھا۔

"بیگم نہیں محکمہ خُفیہ کے اعلیٰ افسر ضیغم صاحب سے۔ سمجھ گئے؟" نیازی صاحب نے سمجھایا۔

"جی۔ اچھّی بات ہے۔ ابھی مِلاتا ہوں۔" پی اے نے جواب دیا اور کھٹا کھٹ نمبر ملانے لگا۔

چند ہی لمحوں میں پی اے نے لائن مِلا کر اپنا ریسور رکھ دیا۔

"فرمائیے جناب، حاضر ہوں۔" یہ ضیعغم صاحب کی آواز تھی۔

"کہیے، کیسے مزاج ہیں؟ خیریت؟" نیازی صاحب نے پوچھا۔

”خُدا کا شکر ہے۔ آپ کیسے ہیں؟“ ضیغم صاحب نے کہا۔ ”بس اللہ کا کرم ہے۔ سب خیریت ہے۔“

”کیسے یاد فرمایا۔ کوئی خدمت؟“

”جناب، ایک بہت اہم معاملہ ہے۔ ملک کا امن و امان خطرے میں نظر آ رہا ہے۔ اِس سِلسلے میں آج میں نے اپنے عملے کے تمام افسروں کی ایک میٹنگ بلائی ہے اور مُجھے آپ کے مشوروں کی بھی ضرورت ہوگی۔“

”تو کیا میٹنگ میں حاضر ہو جاؤں؟ کِس وقت ہے؟“

”وہ میٹنگ تو گیارہ بجے سے شروع ہو رہی ہے۔ دو منٹ باقی ہیں۔“ نیازی صاحب نے کہا۔ ”میرا مطلب تھا اگر آپ بارہ بجے تشریف لا سکیں تو بہتر ہوگا۔ جب تک میں میٹنگ سے نپٹ چکوں گا۔ کہئے مُمکن ہے؟“

”بُہت بہتر، حاضر ہو جاؤں گا۔ کوئی اور حُکم۔“ ضیغم صاحب بولے۔

”بس شکریہ۔ میں انتظار کروں گا۔ خُدا حافظ۔“

”خُدا حافظ۔“ ضیغم صاحب کی آواز آئی اور پھر سِلسلہ ختم ہو گیا۔

ٹیلی فون رکھنے کے بعد نیازی صاحب نے ایک بار پھر گہرا سانس لے کر کُرسی سے ٹیک لگائی، جیسے کُچھ دیر آرام کرنا چاہتے ہوں۔ مگر دوسرے ہی لمحے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے بُڑبُڑائے۔ ”صرف ایک مِنٹ باقی ہے۔ اب مُجھے میٹنگ میں پہنچنا چاہیے۔“ اور ٹائی کی گانٹھ کو ٹھیک کرتے ہوئے وہ اطمینان کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

صدر ایّوب کی حکومت ختم ہوئے کُچھ ماہ گُزر چکے تھے۔ اِس کے ساتھ ہی ہنگاموں کا وہ طوفان بھی تھم گیا تھا جس نے پورے پاکستان کو اپنی لپیٹ

میں لے رکھا تھا۔ اب ملک میں ہر طرف امن و امان تھا۔ صدر یحییٰ خان کی حکومت نے اب تک جو کچھ کیا تھا اُس سے یہ بات صاف ہو چکی تھی کہ وہ عوام کو حکومت سونپنے کا اٹل ارادہ رکھتے ہیں۔ اِس طرح مُستقبل کے بارے میں بھی کسی کو یہ اندیشہ نہ رہا تھا کہ جمہوریت کو ٹالنے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود صدر یحییٰ کی حکومت کی نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض لوگ اِس قسم کی حرکتیں کرنے میں لگے ہوئے تھے جس کے نتیجے میں مُلک زبردست بدامنی کا شکار ہو سکتا تھا۔

یہ بات مُلک اور عوام کے ہر سچّے خیر خواہ کے لیے خاصی پریشانی کی تھی۔ نیازی صاحب اس بارے میں دوسروں سے کہیں زیادہ فکرمند تھے۔ اور ایسا ہوتا ہی چاہیے تھا۔ وہ مُلک کا امن و انتظام سنبھالنے والے محکمے کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ یہ اُن کا فرض تھا کہ وہ ہر قسم کے اندیشوں کا جائزہ لیں۔

حکومت کو اُن کی اصلیّت سے آگاہ کریں اور اُس کی پالیسی کے مطابق ملک کے سارے محکموں کی رہنمائی کریں۔

میٹنگ روم نیازی صاحب کے کمرے سے کُچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے وہ خاص دروازے سے داخل ہوئے۔ میٹنگ میں شریک ہونے والے تمام لوگ لمبی میز کی آمنے سامنے والی کُرسیوں پر بیٹھ چکے تھے اور سِرے کی کُرسی کے علاوہ ساری کُرسیوں پر تھیں۔ نیازی صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بُلند آواز سے السّلامُ علیکم کہا۔ جواب میں سب لوگوں نے وعلیکُمُ السّلام کہا اور تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نیازی صاحب کُرسی پر بیٹھ گئے تو دوسرے لوگوں نے بھی اپنی اپنی سیٹ سنبھالی۔ چند لمحوں کے لیے مجمع پر خاموشی چھا گئی۔ نیازی صاحب ہر شخص کے چہرے پر نگاہیں دوڑاتے رہے اور پھر ایک ایک لفظ پر زور

دیتے ہوئے بولے۔

”حضرات! چٹھی کے ذریعے آپ سب پر اِس میٹنگ کا مقصد واضح کیا جا چکا ہے۔ آپ تجربہ کار افسر ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ معاملے کے ہر پہلو پر اچھّی طرح غور کر کے آئے ہوں گے اور یہاں اپنی بہترین رائے پیش کریں گے۔ اِس بات کا خاص خیال رکھیے کہ توجّہ اصل معاملے سے اِدھر اُدھر نہ بھٹکنے پائے۔ احتیاطاً پھر یہ عرض کر دوں کہ ہمارے سامنے تین اہم 8 سوالات ہیں:

نمبر ۱۔ کیا یہ واقعہ ہے کہ ملک میں خانہ جنگی کی فضا تیّار کی جا رہی ہے؟

نمبر ۲۔ وہ کیا باتیں ہیں جو عوام کے درمیان خون خرابے کے امکانات پیدا کر رہی ہیں اور اِن باتوں کو کون لوگ ہوا دے رہے ہیں؟

نمبر ۳۔ اگر پاکستان خُدا نخواستہ آپس کے جھگڑوں میں مُبتلا ہو جائے تو کیا اِس سے ہمارے دُشمنوں کو یہ موقع نہ مل جائے گا کہ وہ دباؤ ڈال کر ہم سے اپنی من مانی باتیں منوالیں۔ یہ اندیشے درست ہوں تو کیا یہ سمجھنا غلَط ہو گا کہ جو لوگ ایسی حرکتیں کر رہے ہیں وہ جان بوجھ کر یا اَن جانے طور پر دُشمن کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔“

یہ کہہ کر نیازی صاحب خاموش ہو گئے اور کرسی کی پشت سے ٹھیک لگا کر حاضرین کے چہروں کا جائزہ لینے لگے۔

کمرے میں کُچھ دیر تک سنّاٹا چھایا رہا۔ چند لمحے تو نیازی صاحب صبر کے ساتھ انتظار کرتے رہے مگر جب اُنھوں نے لوگوں کو گہری سوچ میں ڈوبتا محسوس کیا تو اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک افسر سے بولے۔

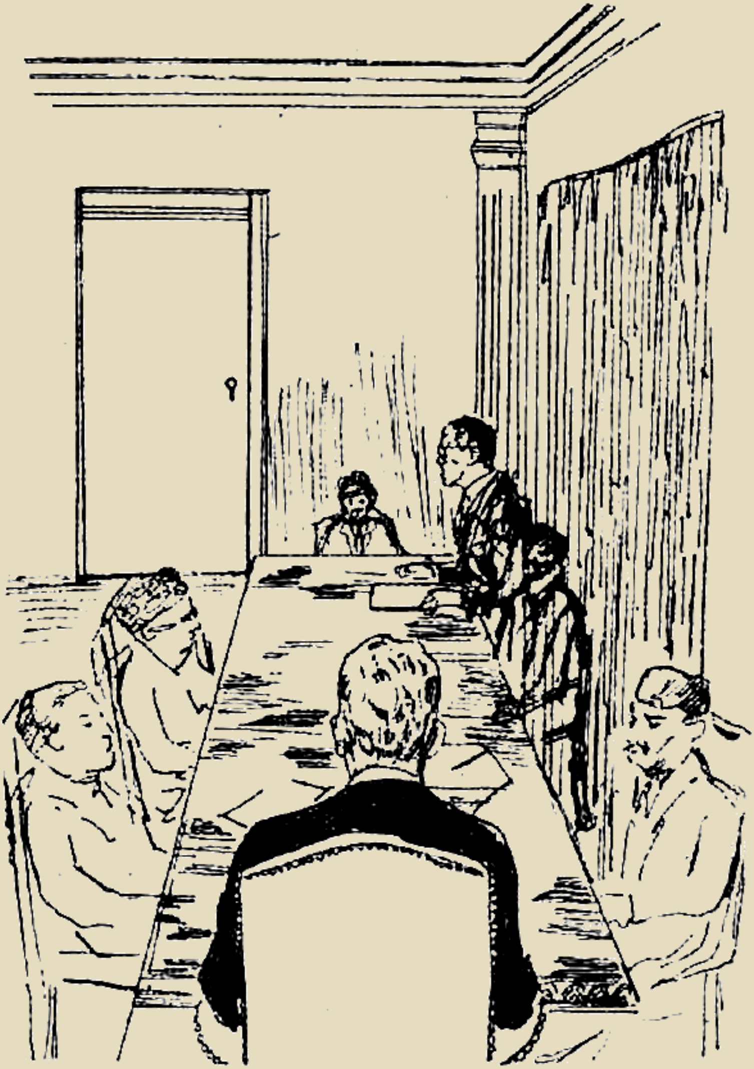

"ملک صاحب، جب تک دُوسرے سوچیں آپ ہی کُچھ فرمائیے۔" "جی، بُہت بہتر۔" ملک صاحب نے چونکتے ہوئے جواب دیا اور پھر اُنہوں نے کہنا شروع کیا:

"جناب والا، مُجھے آپ کی رائے سے اتّفاق ہے۔ ہمارے ملک کی تمام سیاسی جماعتیں اور لیڈر وطن دوست ہیں۔ پاکستانی عوام کی وطن دوستی پر بھی کسی قسم کا شُبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے عوام پچھلی حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے اور اُنہیں اُس سے بہت سی شکائتیں تھیں۔ اسی لیے جب سیاسی جماعتوں نے اُنہیں اُکسایا تو وہ طوفان بن کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُنہوں نے اپنی نفرت اور بے اطمینانی کا اظہار توڑ پھوڑ اور ہنگاموں سے کیا۔ ایسی باتیں ہر ملک میں ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی انوکھی بات نہیں۔ لیکن ایک چیز جس کی طرف آپ نے توجّہ دلائی ہے اور میں سمجھتا

ہوں وہ سو فی صد درست ہے، یہ ہے کہ ہمارے کُچھ دُشمن ملک پاکستانی عوام کی بے چینی سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ اُن کے ایجنٹ ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ مارشل لا لگنے کے بعد اُن کی سرگرمیاں کم ضرور ہو گئی ہیں مگر بالکل ختم نہیں ہوئیں۔ وہ اب بھی طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر عوام کو ہنگاموں پر اُکسا رہے ہیں تاکہ پاکستان میں ہر طرف توڑ پھوڑ اور مار دھاڑ کا بازار گرم ہو جائے اور یہاں کوئی مضبوط عوامی حکومت قائم نہ ہو سکے۔ جنابِ والا، میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا سب سے پہلا فرض اِن ایجنٹوں کا کھوج لگانا ہے۔"

ملک صاحب کی تقریر سے کمرے میں موجود ہر شخص کے چہرہ پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اُنھوں نے سب کے دِل کی بات کی ہے۔ دوسرے لوگوں نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا اور میٹنگ ختم ہو گئی۔

نیازی صاحب اِس میٹنگ کے نتیجے سے بہت مُطمئن تھے اور یہی وجہ تھی کہ جب وہ اپنے ساتھیوں سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو رہے تھے تو اُن کے لبوں پر مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

بارہ بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ نیازی صاحب میٹنگ روم سے نکل کر تیزی کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔ اُنہیں محکمہ خفیہ کے افسرِ اعلیٰ مسٹر ضیغم کا انتظار تھا جنہیں اُنہوں نے بارہ بجے بُلایا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے کمرے کے سامنے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر دروازے پر موجود چپڑاسی نے ہلکا سا اشارہ کیا۔ اپنے خیالات میں ڈوبے ہونے کی وجہ سے اُنہوں نے اُس پر کوئی توجّہ نہ دی۔ لیکن دروازہ کھول کر جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا، ایک دم ٹھِٹھک کر رہ گئے۔ کوئی شخص اُن کی طرف پشت کیے ہوئے اطمینان سے ایک کاغذ پڑھ رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ شخص

پھرتی کے ساتھ پلٹ کر اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

وہ ایک لمبا تڑنگا اور گٹھے ہوئے بدن کا آدمی تھا اور اُس نے کتھئی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔

"اوہ۔ آپ آ گئے۔" نیازی صاحب کے منہ سے نکلا۔ "میں آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کب آئے؟"

"کوئی چار منٹ پہلے۔" اجنبی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کہیے میٹنگ کیسی رہی؟"

"بہت کامیاب۔" نیازی صاحب نے جواب دیا اور اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "تشریف رکھیے۔ ہمیں ایک معاملے میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔"

"میں حاضر ہوں۔ حُکم فرمائیے۔" ضیغم صاحب نے کُرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ دیکھ رہے ہیں۔" نیازی صاحب نے کہنا شروع کیا۔ "کہ مُلک میں پچھلے کئی ماہ سے ایک جنونی فضا پیدا کی جا رہی ہے۔ اب تک ہم اس انتظار میں تھے کہ سیاسی جماعتیں اس کی تباہ کاریوں کا اندازہ لگا کر خود ہی اس کا کوئی توڑ نکالیں گی مگر وہ سب نفسا نفسی میں مُبتلا ہیں اور پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ اب ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ حالات کو جلد از جلد سنبھالا جائے ورنہ نہ صرف آنے والے انتخابات خطرے میں پڑ جائیں گے بلکہ مُلک کا مُستقبل بھی تاریک ہو جائے گا۔ مُجھے یقین ہے کہ دُشمنوں کے ایجنٹ ہمارے مُلک میں سرگرم ہیں اور وہ مُلک کی سیاسی جماعتوں کے جھگڑوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔"

نیازی صاحب اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ اچانک میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اُنھوں نے ٹیلی فون اُٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"جناب۔" دوسری طرف سے نیازی صاحب کا پی اے بول رہا تھا۔ "ضیغم صاحب سے محکمۂ خارجہ کے افسرِ اعلیٰ زمان صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔"

نیازی صاحب نے خاموشی کے ساتھ ٹیلی فون ضیغم صاحب کے حوالے کر دیا۔ ٹیلی فون کان سے لگاتے ہوئے وہ بولے۔

"جی جناب، حاضر ہوں۔ ارشاد؟"

"ایک بہت اہم معاملہ ہے۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "فُرصت ملتے ہی تشریف لائیے۔"

خبردار

”بہت بہتر۔ یہاں سے اُٹھ کے سیدھا آپ ہی کے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔“ یہ ضیغم صاحب نے جواب دیا۔ اور ٹیلی فون میز پر رکھ دیا۔

”جی جناب۔“ ضیغم صاحب نے نیازی صاحب سے کہا : ”آپ دُشمن کے ایجنٹوں کے بارے میں کُچھ فرما رہے تھے۔“

”ہاں۔“ نیازی صاحب چونکتے ہوئے بولے۔ ”میں اس غیر ملکی ایجنٹ گروہ کو قانون کے شکنجے میں دیکھنا چاہتا ہوں مگر یہ بہت کٹھن اور مشکل

معاملہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کی تحقیقات ایسے افسر کے حوالے کریں جو بہت تجربہ کار ہو۔“

ضیغم صاحب کُچھ دیر سوچتے رہے پھر سنبھل کر بولے۔ ”جناب، میری نظر میں سب سے زیادہ موزوں شخص مسٹر اظہر قریشی ہیں۔ گزشتہ حکومت نے کسی وجہ سے اُنہیں وقت سے پہلے ریٹائر کر دیا تھا۔ میری سفارشوں اور آپ کی کوششوں سے اپریل میں ہی اُن کا ایک سال کے لیے تقرّر کیا گیا ہے۔ میرا محکمہ اُن کے کام پر فخر کرتا ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو یہ معاملہ اُن ہی کے سپرد کر دوں۔“

”بے شک، بے شک۔“ نیازی صاحب نے کہا۔ ”میں انہیں اچھّی طرح جانتا ہوں۔ آپ یہ تحقیقات اُن کے حوالے کر دیجیے۔“

”بہت بہتر جناب۔ اب اجازت؟“ ضیغم صاحب اُٹھتے ہوئے بولے۔

"اچھّی بات ہے۔" نیازی صاحب نے کہا اور پھر ہاتھ ہلاتے ہوئے بولے۔ "خُدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" ضیغم صاحب نے کہا اور جچے تُلے قدم اُٹھاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

نیازی صاحب کے کمرے سے ملا ہوا دوسرا کمرہ اُن کے پی اے کا تھا۔ ضیغم صاحب جاتے جاتے اُس کے کمرے میں چلے گئے۔ پی اے کان سے ٹیلی فون لگائے کسی سے بات کر رہا تھا۔ اُنہیں دیکھتے ہی اُس نے اُٹھنا چاہا مگر ضیغم صاحب نے اُس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے بٹھا دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُنھوں نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر کُچھ لکھ کر اُس کے سامنے بڑھا دیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"مہربانی کر کے میرے دفتر اطلاع کر دیجیے گا کہ میں یہاں سے محکمۂ خارجہ کے اعلیٰ افسر زمان صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔ شکریہ۔"

ٹیلی فون پر باتیں کرتے ہوئے پی اے نے کاغذ کا ٹکڑا لے لیا۔ مگر اِس سے پہلے کہ وہ اس کی عبارت پڑھتا یا کوئی جواب دیتا، ضیغم صاحب اطمینان سے باہر چل دیے۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ زمان صاحب کے کمرے کے سامنے تھے۔ چپڑاسی نے اُنہیں دیکھتے ہی لپک کر دروازہ کھول دیا۔ جیسے اُسے پہلے ہی سے حُکم دے دیا گیا تھا۔ زمان صاحب کے چہرہ پر فکر مندی اور نگاہوں میں بے چینی کے آثار تھے۔

"خیریت؟ آپ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔" سلام دُعا کے بعد ضیغم صاحب نے سوال کیا۔

"جی ہاں۔ دُشمن تاریکی میں ہم پر حملہ کر رہا ہے۔"

"جی؟ کیا مطلب؟"

”اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ حملہ کِس طرف سے ہو رہا ہے، کِن ہتھیاروں سے کام لیا جا رہا ہے یا کِن چیزوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے؟“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”مُجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ جو کُچھ میں کہہ رہا ہوں وہ حقیقت ہے یا صرف کہانی۔“

زمان صاحب کی اِن باتوں سے ضیغم صاحب کے چہرے پر بھی اندیشے کا احساس جھلکنے لگا تھا۔ وہ کوئی اور سوال کرنا چاہتے تھے کہ زمان صاحب نے ایک کاغذ اُن کی طرف بڑھا دیا۔ یہ ایک موٹا چوکور کاغذ تھا اور اُس پر یہ پُر اسرار عبارت لکھی تھی:

”ندبھا پنم اسٹاک ایکسچینج ہدایت نامہ پنم بیوپاریوں کے نام۔

بازار میں نیا مال آ گیا ہے۔ پُرانا سنبھال کر رکھو۔ آرام کرو۔ آسمانی

سرکس دیکھو اور تالیاں بجاؤ۔ تمہارے مال کی ضرورت پڑی تو آرڈر دیا جائے گا۔“

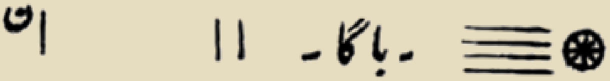

ضیغم صاحب نے کاغذ پر نگاہیں جما دیں۔ وہ اُس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک نشان کو بڑی غور سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کے چہرے اور نگاہوں میں رہ رہ کر جوش اور کھوج کی چمک پیدا ہو رہی تھی۔

”بہت ہی پُر اسرار ہے۔“ وہ بُڑبُڑائے اور سوالیہ نگاہوں سے زمان صاحب کو گھورتے ہوئے بولے۔ ”یہ آپ کو کب اور کیسے ہاتھ آیا؟“

”قریباً ایک ماہ ہوا۔“ زمان صاحب نے جواب دیا۔ ”ایک دُشمن ملک میں یہ ہمارے سفارت خانے کو ملا تھا اور وہاں سے میرے پاس بھیج دیا گیا۔ مجھے اِس سِلسلے میں صرف اِتنا بتایا گیا تھا کہ دُشمن مُلک کے جاسوسی کے

ادارے سے یہ اپریل ۱۹۶۹ء کے پہلے ہفتے میں جاری کیا گیا تھا۔“

”یہ کس طرح سمجھا گیا کہ اِس کا ہمارے ہی مُلک سے تعلّق ہے؟“

”اِس کے الفاظ اور آخر کے نشانات سے۔“

”وہ کیسے؟“

”دیکھیے۔ عبارت کے پہلے حصّے میں لفظ ’ندبھا پنم‘ یک جا استعمال ہوا ہے اور دوسرے حصّے میں صرف ’پنم‘ کا لفظ ہے۔ اِس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ’ندبھا‘ اور ’پنم‘ دو الگ الگ چیز ہیں۔“

اتنا کہہ کہ زمان صاحب ایک کاغذ پر لکھ کر سمجھاتے ہوئے کہنے لگے۔ اب اگر ہم پہلے لفظ کے حصّے ”بھا‘ پر غور کریں تو اِس سے ہمارے ایک دُشمن مُلک کا نام ذہن میں آ جاتا ہے۔ اِسی طرح دوسرے لفظ پنم میں سے میم کو نکال دینے سے ’پ‘ اور ’ن‘ رہ جاتے ہیں جس کا مطلب پاکستان

ہے۔ اِس طرح اس پُراسرار ہدایت نامے کا تعلّق ہمارے مُلک سے ظاہر ہوجاتا ہے۔“

”لیکن پہلے لفظ کے پہلے حصّے ‘ند’ اور دوسرے لفظ کے آخری حرف ‘میم’ سے کیا سمجھا جائے؟“

”لفظ ‘ند’ بے معنی ہے۔ البتّہ اگر ہم اسے بھی دو الگ الگ حروف ‘ن’ اور ‘د’ کی شکل میں سامنے رکھیں تو یہ حروف بامعنی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اِن سے اُس شہر کا نام نکلتا ہے جو دُشمن ملک کا دارالحکومت ہے اور جہاں سے یہ ہدایت نامہ جاری ہوا ہے یعنی ‘ن’ سے ‘نئی’ اور ‘د’ سے خُود سمجھ لیجیے۔“

”بہت خوب اور نیم کے میم سے؟“ ضیغم صاحب نے کہا۔

”یا تو یہ میم دھوکا دینے کے لیے شامل کیا گیا ہے یا اِس سے مُراد مغربی

ہے۔ یعنی پاکستان مغربی۔ کہیے کیا خیال ہے آپ کا؟"

"بہت خوب۔ مگر میں ابھی اِسے بالکل درست نہیں کہہ سکتا۔"

"اچھّی بات ہے۔" زبان صاحب نے کہا۔ "اب آخری سطر میں لفظ 'باگا' کے دائیں بائیں والے نشانات پر غور کیجیے۔ ایک جانب اور نیچے ایک جتنے فاصلے سے چار لکیریں ہیں اور اُن کے دائیں جانب ایک چھوٹا سا گول چکّر بنا ہوا ہے۔ دوسری جانب تین کھڑی لکیریں ہیں۔ اُن میں سے پہلی دو لکیروں کا درمیانی فاصلہ کم اور دوسری اور تیسری لکیر کا درمیانی فاصلہ تقریباً چار گنا زیادہ ہے۔ تیسری لکیر کے بعد 'ن' جیسا حرف بنا ہوا ہے۔ اب اگر آپ ایک طرف والے گول چکّر کو اوپر تلے والی لکیروں کے درمیان میں رکھ کر اُن لکیروں کے سِروں کو دائیں بائیں سے دو سیدھی لکیروں سے بند کر دیں اور اِسی طرح دوسری طرف والی دوسری اور تیری کھڑی لکیروں کے درمیانی فاصلے میں 'ن' کو رکھ کر اوپر نیچے سے

اُس کی کھڑی لکیروں کے سروں کو دو متوازی لکیروں سے ملا دیں تو اُن کی یہ شکل سامنے آجائے گی۔

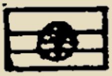

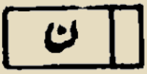

"اب فرمائیے۔" زمان صاحب نے کاغذ پر یہ نشانات بنا کر ضیغم صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے کہا: "کیا اِن میں سے ایک ہمارے دُشمن ملک کے اور دوسرا ہمارے مُلک کے پرچم کو تصوّر سامنے نہیں لاتا۔ کیا اِس سے یہ بات صاف نہیں ہو جاتی کہ اِس پُر اسرار ہدایت نامہ کا تعلّق ہمارے ہی ملک سے ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔ ضرور ہو سکتا ہے۔" ضیغم صاحب بُڑبُڑائے اور پھر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولے۔ "اور اب میں اِس ہدایت نامے سے یہ معنی نکالتا ہوں کہ دُشمن ایک مدّت سے ہمارے یہاں خاموشی سے اپنے جاسوسوں کا ایک نیا گروہ منظّم کرتا رہا ہے۔ اپریل ۱۹۶۹ء کے پہلے ہفتے

تک اِس گروہ نے اپنی جڑیں اِس حد تک مضبُوط کر لیں کہ اِس کے سِوا دوسرے تمام ایجنٹوں کی سر گرمیاں ختم کر دی گئیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ چھے ماہ سے ہمارے یہاں دُشمن کے ایجنٹوں کا یہ نیا پُراسرار گروہ ہی سر گرم ہے۔ 'آسمانی سرکس' سے شاید یہی گروہ مُراد ہے۔ اور اِس آخری لفظ 'باگا' سے کیا سمجھا جائے؟" ضیغم صاحب اچانک پُوچھ بیٹھے۔

"صرف یہ۔" زمان صاحب نے سمجھاتے ہوئے کہا کہ اصل ہدایت کی عبارت لفظ 'با' سے شروع ہو کر 'گا' پر ختم ہوتی ہے۔

"لیکن جب آپ یہ سارے نتیجے نکال چکے تھے تو ایک ماہ پہلے ہی واضح کر دیتے۔ اِتنا وقت تو بے کار نہ جاتا۔" ضیغم صاحب نے کہا۔

"یہ باتیں مُجھے آج ہی صرف آدھ گھنٹہ پہلے اپنے سفارت خانہ سے معلوم ہوئی ہیں۔" زمان صاحب اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولے۔ "اب میں

اِسی وقت یہ معاملہ آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ جس قدر جلد مُمکن ہو موزوں ترین افسر کو تحقیقات پر مُقرّر کیجیے۔“

ہولناک چیخ

سورج ڈھل رہا تھا۔ موسم خوشگوار اور آسمان بالکل صاف تھا۔ کراچی کی زِندگی میں اُس وقت زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ایک جانب دفتروں اور کارخانوں سے دِن بھر کا کام ختم کر کے نکلنے والے لوگوں کے ہجوم بس سٹاپوں اور ریلوے اسٹیشنوں کی طرف لپک رہے تھے۔ سڑکوں پر دھاڑتی چنگھاڑتی سواریوں کی سیدھی اور بل کھاتی قطاریں دوڑی چلی جا رہی تھیں۔ جگہ جگہ سڑک پار کرنے والے لوگ موقع ملنے کے انتظار میں کھڑے

سوکھ رہے تھے اور دوسری طرف منوڑا، کیماڑی اور کلفٹن کی عوامی تفریح گاہیں عورتوں مردوں اور بچّوں کے قہقہوں اور آلو چھولے، گول گپّے والوں کی آوازوں سے گونج رہی تھیں۔ الفنسٹن سٹریٹ کے فٹ پاتھ اور بوری بازار کی گلیاں خُوشبوؤں میں بسے خریداروں اور سیر کرنے والوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ہوٹلوں کی رونقیں دوبالا ہو رہی تھیں۔ سینیما ہاؤسوں میں شوقینوں کی قطاریں لگ رہی تھیں۔ فرئر ہال اور جہانگیر پارک میں میلا سا جم رہا تھا۔

لالوکھیت، نیو کراچی روڈ پر کریم آباد کے سامنے والے حصّے میں اُس وقت ہمیشہ خاص قسم کی چہل پہل ہوتی ہے۔ اس ٹکڑے میں سڑک کے بیچوں بیچ سبز گھاس کے لمبے اور کشادہ تختے بنے ہوئے ہیں اور یہ تختے ارد گرد کے بچّوں اور عورتوں کی خاص تفریح گاہ ہیں۔ ٹریفک کی پُر شور موجوں کے درمیان اُن کی حیثیت پُر سکون جزیروں کی سی ہوتی ہے اور اس میں بیٹھ کر

کھُلی فضا اور ماحول کا لُطف لینے کی بات ہی اور ہے۔

کریم آباد کے سامنے والے بنگلوں کے پیچھے کی آبادی کُچھ بکھری ہوئی سی ہے۔ اُنھیں میں سے ایک کونے والے بنگلے سے ۱۴ اور ۱۶ سال کی عمر کے دو بھائی باہر آتے ہیں۔ دونوں کرتا پاجامہ اور اسپنج کی چپلیں پہنے ہیں اور ننگے سر ہیں۔ آپس میں وہ کُچھ اتنے ہم شکل ہیں کہ دُور سے صرف قد کے فرق سے ہی پہچانے جا سکتے ہیں۔ بڑے کا نام جاوید ہے اور چھوٹے کا پرویز جسے گھر کے لوگ "پرّو" کہتے ہیں۔

یہ دونوں گھر سے تو چلے تھے سیر کرنے کے لیے مگر سڑک کے کنارے پہنچنے پر جب کافی دیر انتظار کے باوجود اُنھیں سڑک پار کرنے کا موقع نہ ملا تو فٹ پاتھ پر ٹہلتے ہوئے کھُلے اور نیلے آسمان پر نگاہیں دوڑانے لگے۔ اُسی لمحے پرویز کو اچانک کوئی خیال آ گیا۔ اُس نے جاوید کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

بھائی وہ جاوید کو بھائی کہا کرتا تھا۔ چلو گھر چلیں۔ ”

”کیوں؟“ جاوید نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”موسم بُہت اچھّا ہے۔ وائرلیس پر دُور دُور کی باتیں سُنیں گے۔ ”

”ارے ہاں۔“ جاوید نے اِس طرح کہا جیسے یہ بات اُسے بُہت پسند آئی ہو۔ دونوں خوشی خوشی گھر کی طرف چل دیے۔ لیکن چند ہی قدم چل کر جاوید نے پرویز کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر تُم نے وائرلیس کہا۔ کتنی دفعہ تمھیں سمجھا چکا ہوں کہ وہ وائرلیس نہیں ہیں، ہیم ریڈیو سیٹ ہے۔ ہیم ریڈیو۔ ”

”ہونے دو۔“ پرویز نے کہا۔ ”مُجھے ریڈیو کا نام اچھّا نہیں لگتا۔ بھلا ریڈیو سے وائرلیس کی طرح دُور دُور تک بات چیت کی جا سکتی ہے؟ ”

”مگر جناب وائرلیس سے بھی ہیم ریڈیو سیٹ کی طرح دُور کے ٹرانسمیٹروں

سے بات نہیں کی جا سکتی۔" جاوید نے چڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھّا چلو، ہیم ریڈیو سیٹ۔" پرویز نے کہا۔ "اب تو خوش ہو؟"

"ہاں۔ ہر چیز کا ٹھیک ٹھیک نام لینا چاہیے۔ بولو۔ او کے۔" جاوید نے کہا۔

"او کے۔" پرویز چیخا اور دونوں ہنستے ہوئے گھر کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

جب یہ لڑکے اپنے پھاٹک کے بغلی دروازے سے گھر کے اندر داخل ہو رہے تھے تو ایک پُراسرار شخص دُور کھڑا اُن کے بنگلے کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکوں کو دیکھ کر وہ جیسے چونک گیا اور جب لڑکے بنگلے میں داخل ہوئے تو اُس نے تیزی سے سڑک پار کی اور بنگلے کے پھاٹک پر لگی ہوئی نام کی ایک چھوٹی سی تختی کو دیکھنے لگا۔ تختی پر نگاہ ڈالتے ہی اُس

کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ جیسے وہ اِسی بنگلے کی تلاش میں تھا۔ تختی پر لکھا تھا۔

اظہر قریشی گورنمنٹ کنٹریکٹر

یہ وہی اظہر قریشی تھے جن کا ذکر ضیغم صاحب نے نیازی صاحب سے کیا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد قریشی صاحب نے ٹھیکیداری شروع کردی تھی اور اپنے اس چھ سو گز پلاٹ بنگلا بنا لیا تھا مگر تقریباً چھ ماہ سے وہ پھر محکمہ خُفیہ کی خدمت انجام دے رہے تھے لیکن اُن کی یہ ملازمت خُفیہ رکھی گئی تھی اور چند بڑے افسروں کے سوا محکمے کے کسی شخص کو اِس کا پتا نہ تھا۔ ضیغم صاحب سے ان کا براہِ راست تعلّق تھا اور وہ انہی سے ہدایات لیتے تھے۔ اِس مقصد کے لیے یا تو وہ اِس ہیم ریڈیو کو کام میں لاتے جو اُنہیں دیا گیا تھا یا پھر پنڈی جا کر اُن سے خود مل لیا کرتے۔ جاوید اور پرویز انہی کے ہونہار بیٹے تھے۔ اپنے والد کی طرح ان دونوں کو بھی سُراغ رسانی سے

لگاؤ تھا۔ اُن کا ایک بھائی ندیم بھی تھا۔ اُس کی عمر چھ سال تھی اور آج کل وہ راولپنڈی میں اپنے چچا کے یہاں تھا۔

جاوید اور پرویز جیسے ہی پھاٹک کے اندر داخل ہوئے، اُن کی امّی بول پڑیں۔ "ارے اتنی جلدی لوٹ آئے؟ آج گھومنے کو دِل نہیں چاہ رہا؟" وہ لان میں چہل قدمی کر رہی تھیں۔

"بات کُچھ ایسی ہی ہے۔" جاوید نے کہا۔

"ہم لوگ ذرا وائرلیس، اوہ کیا کہتے ہیں ہیم ریڈیو سے شوق فرمائیں گے۔" پرویز شوخی سے بولا۔

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ کیا تہذیب سیکھی ہے۔" امّی نے مُنہ بنا کر کہا۔

"امّی پلیز۔ آپ مُجھ سے ادب سے بات کیا کیجیے۔" جاوید نے ذرا اکڑ کر کہا۔

"ہائیں کیا کہا؟ میں اور تُجھ سے ادب سے بات کیا کروں؟" امّی نے

تیوریوں پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔ بالکل۔" جاوید اُن کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"چھوٹوں کو بڑوں سے ادب سے بات کرنی چاہیے۔ آپ خود دیکھ لیجیے۔" اُس نے امّی کے برابر کھڑے ہو کر کہا۔ "آپ بڑی ہیں یا میں؟" جاوید کی امّی کا قد پانچ فٹ ایک انچ تھا اور جاوید اب اُن سے کوئی ایک ڈیڑھ انچ اُونچا ہو چکا تھا۔

"نالائق کہیں کا۔" امّی ہنس کر بولیں۔ خالی قد بڑھ جانے سے کوئی بڑا بن جاتا ہے؟" یہ کہہ کر اُنھوں نے اُسے ایک چپت رسید کی مگر وہ پھرتی کے ساتھ اُن کی زد سے نکل گیا اور پھر دونوں بھائی زور زور سے قہقہے لگاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔

والد کے مُطالعے کے کمرے میں پہنچ کر جاوید نے ہیم ریڈیو کا سوئچ کھولا اور

ڈائل کی سوئی کو حرکت دینے لگا۔ کسی مقام پر اُنہیں ٹیلی گراف سگنل سنائی دیتے، اور کسی جگہ الیکٹرک سپلائی والوں کی بات چیت۔ کہیں پولیس کے سپاہیوں کی آواز آئی اور کہیں کسی ہوائی جہاز کمپنی کا کوئی پیغام۔ ایک جگہ اِس طرح کی آواز آئی جیسے بہت سی بِلّیاں لڑ رہی ہوں۔ وہ اِس پر حیران ہو ہی رہے تھے کہ کسی نے ایسی زبردست چیخ ماری کہ اُن کا کلیجا ہِل گیا۔

کالا سانپ

پہلی چیخ کی گونج ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک دوسری چیخ سُنائی دی۔ جاوید نے پلک جھپکتے میں ہیم ریڈیو کا سوئچ بند کر دیا اور لان کی طرف دوڑ پڑا۔ پرویز بھی اُس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ یہ چیخیں لان کی جانب سے آتی سُنائی دی تھیں اور اُن لڑکوں کی امّی ہی کی تھیں۔

جاوید اور پرویز لان میں پہنچے تو اُنھوں نے دیکھا کہ پھاٹک کے کھمبوں اور برآمدے کی ساری بتّیاں روشن ہیں۔ امّی برآمدے کے پیچھے کھڑی بے

بےچینی سے اُن کا انتظار کر رہی تھیں۔ اُن کے چہرے سے خوف جھلک رہا تھا۔ جاوید کو دیکھتے ہی اُنھوں نے پھاٹک کے قریب کے سدا بہار کے پودوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "سانپ! کالا سانپ!!"

سورج ڈوب چکا تھا لیکن ابھی اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا۔ اِس جھٹپٹے میں بجلی کی روشنی پوری طرح کام نہیں کر رہی تھی۔ جاوید اور پرویز پھاٹک کی دیوار کے کنارے لگے ہوئے پودوں پر نظریں دوڑانے لگے مگر اُنھیں کُچھ بھی نظر نہ آیا۔ آخر جاوید نے پوچھا۔

"کِدھر ہے؟"

"دیکھتے نہیں وہ سامنے پودے پر۔" امّی نے ایک جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے وہ!" جاوید چیخ پڑا۔ سدا بہار کے سُرخ پھولوں کے دو پودوں پر لگی

ہوئی ایک سیاہ چمک دار چیز پر جاوید کی نگاہیں جم گئیں۔

"ہاں۔ وہ جو شاخوں میں لٹکا ہوا ہل رہا ہے۔ "امّی بولیں۔

"پرویز! جلدی سے ہاکی لے آؤ۔" جاوید نے کہا اور آہستہ آہستہ آہستہ سانپ کی سمت بڑھنے لگا۔

پرویز بھاگ کر دو ہاکیاں لے آیا۔ جاوید نے ایک ہاکی لیتے ہوئے اُس سے کہا۔ "تم اُس طرف سے گھیرو۔"

ایک جانب سے پرویز اور دوسری جانب سے جاوید سانپ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے۔ چند ہی لمحوں میں جاوید اُن پودوں کے قریب پہنچ گیا۔ سانپ خاصا لمبا اور چمک دار سیاہ تھا۔ اس کا اگلا سر ایک شاخ سے اُلجھا ہوا نیچے کی طرف لٹکا ہوا تھا اور گھڑی کے پنڈولم کی طرح آہستہ آہستہ دائیں بائیں ہل رہا تھا۔ جاوید کے قریب پہنچ جانے پر بھی جب اُس نے

ہلنے کے علاوہ کوئی اور حرکت نہ کی تو جاوید سوچ میں پڑ گیا۔ چند لمحے اور انتظار کرنے کے بعد اُس نے سانپ پر وار کرنے کے بجائے ہاکی سے پودوں کو آہستہ سے جھٹکا۔ سانپ نیچے گھاس پر آ رہا۔ پرویز جو قریب پہنچ چکا تھا، سانپ کے گرتے ہی جست لگا کر پیچھے جا پہنچا۔ اُسی لمحے جاوید نے ہاکی پھینک دی اور اپنے دائیں ہاتھ کو سانپ کے پھن کی طرح لہراتا ہوا سانپ کی طرف بڑھنے لگا، جیسے اسے ہاتھ سے پکڑنا چاہتا ہو۔

یہ دیکھتے ہی امّی اور پرویز کی پہلے تو سانسیں رُک گئیں اور پھر دونوں اِکبارگی زور زور سے چیخنے لگے۔

”پیچھے ہٹ جاؤ۔ آگے مت جاؤ۔“

جب جاوید نے کُچھ اثر نہ لیا تو دونوں اُسے پکڑنے کے لیے بے تحاشا جھپٹ پڑے۔ مگر دوسرے ہی لمحے سانپ کی گردن جاوید کی مُٹّھی میں تھی۔ جیسے ہی اُس نے مُٹّھی اُونچی کی سانپ کا دھڑ اُس کی کلائی میں لپٹ

گیا۔ امّی اور پرویز چیختے ہوئے دُور ہٹ گئے اور جاوید نے اپنی کلائی پر سانپ کے لپٹے ہوئے دھڑ کو دوسرے ہاتھ سے دبا لیا۔

"ارے کوئی بچاؤ۔ اللہ رحم۔" امّی چیخنے لگیں۔ "بھائی، پھینک دو۔ کاٹ لے گا۔" پرویز چلّا رہا تھا۔

"ارے، اس کی تو ایسی تیسی۔" جاوید چلّایا اور زور سے سانپ کو گھاس پر پٹخ دیا۔ امّی اور پرویز چُپ ہو کر پیچھے ہٹے تو جاوید نے زوردار قہقہہ لگایا اور ایک بار پھر سانپ کو سر کی طرف سے دو انگلیوں سے اُٹھا کر پٹختے ہوئے بولا۔

"ارے، یہ تو نقلی سانپ ہے۔"

امّی اور پرویز یہ سُن کر ہکّا بکّا رہ گئے۔ اُنھوں نے سانپ پر اپنی نگاہیں گاڑ دیں۔ وہ بالکل بے حرکت تھا۔

پرویز آہستہ آہستہ آگے بڑھا تو جاوید نے پھر سانپ کو اُٹھا لیا اور امّی اور پرویز کی طرف لہراتے ہوئے قہقہے لگانے لگا۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔ میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔" امّی نے اپنے دِل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اور اگر کہیں سچ مُچ کا ہوتا تو؟" اُنھوں نے جاوید کی طرف دیکھتے ہوئے تھے۔

"تو میں ہاکی سے اُس کا کچومر بنا دیتا۔" جاوید نے کہا۔

"مگر تم سمجھے کیسے کہ یہ نقلی ہے۔" پرویز نے پوچھا۔

"اِس کے لیے عقل کی نہیں، ہوش و حواس کی ضرورت تھی۔ میرے قریب پہنچنے پر اور اس کے بعد جھاڑی سے گِرنے کے باوجود جب اُس نے کوئی حرکت نہ کی تو میں سمجھ گیا کہ نقلی ہے۔" جاوید بولا۔

"مگر یہ شاخوں میں ہل جو رہا تھا۔" پرویز نے کہا۔

"وہ اپنے وزن اور ہوا کی وجہ سے ہل رہا تھا۔ آخر اسپنج کا سانپ ہے۔" جاوید نے کہا۔

"لاؤ دکھاؤ۔" پرویز نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

برآمدے کی روشنی میں امّی اور پرویز دونوں باری باری سانپ کو ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھتے رہے۔ یہ جاپان کا بنا ہوا تھا اور ہو بہُو اصلی سانپ جیسا تھا۔ وہ بالکل سیدھا بھی ہو سکتا تھا اور بل بھی دیا جا سکتا تھا۔

"یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟" امّی نے سوال کیا۔

"بھائی کا کوئی دوست ہو گا۔" پرویز بولا۔

"نہیں۔ دوستوں سے میرا ایسا مذاق نہیں ہوتا۔" جاوید نے کہا۔

"تو پھر۔ یہ ڈیڈی کے کسی دُشمن کی حرکت ہو گی۔" پرویز بولا۔

"ہو سکتا ہے۔" جاوید نے غور کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی مُمکن ہے کہ کسی

مُجرم نے ہمیں ڈرانے کے لیے یہ حرکت کی ہو۔ ہم بھی تو بد معاشوں کے خلاف جاسوسی کیا کرتے ہیں۔ " "بالکل یہی بات ہوگی۔ تُم لوگ ضرور کوئی مُصیبت کھڑی کروگے۔ "امّی بڑبڑانے لگیں۔ "تمُہارے ڈیڈی ہی جو کُچھ کر رہے ہیں بُہت ہے۔ تُم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ بڑے ہوجاؤ توجو جی میں آئے کرنا۔ یہ بڑا خطرناک کام ہے۔ چھوڑو اِن دھندوں کو اور بھی تو بھتیرے شوق ہیں بچّوں کے۔ یہ جاسوسی ہی رہ گئی ہے کیا؟ "

"ارے امّی، آپ تو ہمیں بُزدلی کا سبق پڑھانے لگیں۔ " جاوید نے کہا۔

"چھوٹے ہیں توکیا ہوا، ہم اظہر قریشی صاحب کے ہونہار بیٹے ہیں۔ "

"ہاں ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔ ہم وہی کریں گے جو ڈیڈی کرتے ہیں۔ " پرویز نے کھڑے ہو کر کہا۔

عین اُسی وقت پھاٹک پر کسی کار کے رُکنے کی آواز آئی اور چند لمحے بعد دراز قد اور چھریرے بدن کا ایک شخص اطمینان کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اُس

کے سر کے بال سلیقے سے پیچھے کی طرف پلٹے ہوئے تھے۔ چہرہ کتابی، بھنویں گھنی، رنگ گندمی، ناک اور ٹھوڑی نوک دار تھی۔ وہ سفید پتلون اور قمیص پہنے تھا۔ اُسے دیکھتے ہی جاوید، پرویز اور اُن کی امّی کے چہرے کھِل گئے۔ یہ اظہر قریشی تھے۔

"بھئی پرّو، جاوید میں تمھارے لیے ایک اچھّی خبر لایا ہوں۔" اظہر قریشی بولے۔

"کیا کوئی نئی کھوج ہے؟" جاوید نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں بھائی۔" اظہر قریشی بولے۔ "تمھیں تو بس کھوج ہی کی سوجھتی ہے۔ ارے بھئی تم لوگ مدّت سے کہتے آئے ہو کہ گھر میں سجاوٹ کے لیے بھُس بھرے جانور لانے چاہئیں۔ سو کل ایک بہت مشہور کاریگر کے بنائے ہوئے جانوروں کا نیلام ہو رہا ہے۔ جا کر دو ایک لے آنا۔"

"ارے واہ ڈیڈی، زندہ باد۔" پرویز نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔

"او کے۔" جاوید نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

"ہائیں یہ کیا؟" سانپ کی طرف لپکتے ہوئے اظہر قریشی اپنی بیگم سے بولے۔

"یہ آپ کے اِن لاڈلوں کو کسی نے انعام میں دیا ہے۔" امّی نے کہا اور پھر فر فر سارا قصّہ بیان کر دیا۔

پوری بات سُننے اور کُچھ دیر سانپ کو اُلٹ پلٹ کر غور سے دیکھنے کے بعد اظہر قریشی کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوئی۔ پھر مُسکراتے ہوئے اُنھوں نے پوچھا۔

"کتنی دیر ہوئی ہو گی اِس بات کو؟"

"زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹا۔" جاوید نے کہا۔ "تو پھر میں ٹھیک وقت پر پہنچا

ہوں۔ "اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے اظہر قریشی بولے۔

سب لوگ انہیں حیرت سے دیکھنے لگے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سانپ کا راز جان چکے ہیں۔ جاوید اور پرویز اس اُمید میں تھے کہ وہ اِس راز پر سے پردہ اُٹھائیں گے مگر ایک لفظ کے سُنے بغیر وہ تیزی کے ساتھ اپنے مطالعے کے کمرے کی طرف چل دیے۔ جاوید اور پرویز بھی اُن کے پیچھے ہو لیے مگر اُن کی امّی آہستہ آہستہ باورچی خانے کی طرف چل دیں۔

جِنوں کا بادشاہ

اظہر قریشی مطالعے کے کمرے میں داخل ہو کر سیدھے اُس میز پر پہنچے جس پر ہیم ریڈیو رکھا ہوا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے آج آپ لوگ اِس سے تفریح لیتے رہے ہیں۔" وہ ڈائل کی سوئی پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولے۔

"ہاں ڈیڈی۔ تھوڑی دیر پہلے ہم یہیں تھے۔" پرویز نے کہا۔

"اوہ ڈیڈی، جس جگہ سوئی ہے اِس جگہ ہم نے آج بڑی عجیب آوازیں سُنی

ہیں۔ ” جاوید نے کہا۔

”عجیب آوازیں؟ “ اظہر قریشی چونکتے ہوئے بولے۔ ”کسی قسم کی؟ “

”بالکل ایسی جیسی کئی بلّیاں ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہی ہوں۔ “

”کبھی پہلے بھی ایسی آوازیں سُنی ہیں؟ “

”جی نہیں۔ ہم اُن کو غور سے سُن ہی رہے تھے کہ امّی کی چیخ سُن کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ “

”یہ بڑی پُراسرار بات ہے۔ کوئی خُفیہ گروہ ہیم سیٹ سے ہی ایسی حرکتیں کرسکتا ہے۔ “ یہ کہتے ہوئے اُنھوں نے ہیم سیٹ کا سوئچ کھول دیا۔

کچھ دیر وہ انتظار کرتے رہے۔ ڈائل کی سُوئی اُسی جگہ تھی جہاں سے لڑکوں کو پُراسرار آوازیں سُنائی دی تھیں۔ دیر تک کوئی آواز نہ آئی تو اُنھوں نے سوئی کو دائیں بائیں حرکت دی مگر وہاں سنّاٹے کے سوا کُچھ نہ تھا۔

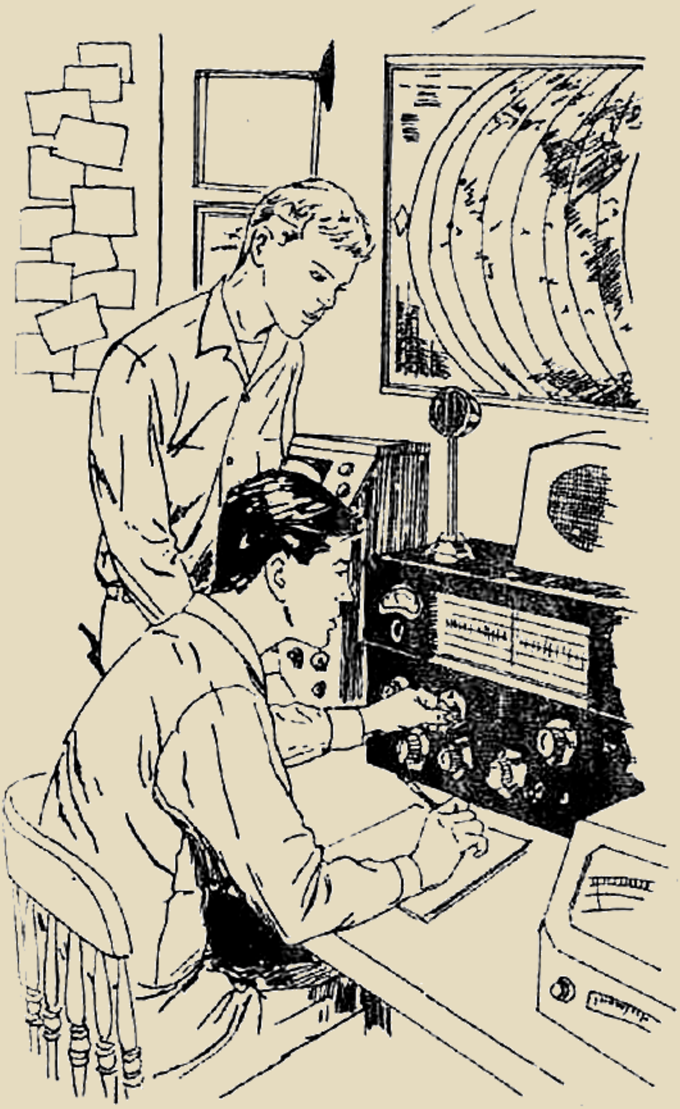

"آیندہ پھر ایسی کوئی آواز سُنائی دے تو اپنے ٹیپ پر ریکارڈ کرلینا۔ وقت اور ڈائل کا صحیح پوائنٹ بھی نوٹ کرلینا۔ "اظہر قریشی جاوید کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ پھر ہیم کے کئی سوئچ کھولنے اور بند کرنے کے بعد ڈائل کی سُوئی کو ایک خاص پوائنٹ پر جما کر وہ گھڑی دیکھنے لگے۔

"ڈیڈی۔ یہ سانپ کا کیا راز ہے؟" جاوید نے پوچھا۔

"تھوڑی دیر صبر کرو۔ جو کُچھ سُنائی دے اُس پر غور کرو، اور خود مطلب نکال لو۔ "ڈیڈی نے جواب دیا

"او کے۔" جاوید نے سر ہلاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

اُسی لمحے سپیکر پر ٹیلی فون کی سی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ پرویز کُچھ بولنا چاہتا تھا کہ ڈیڈی نے اُسے چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وقفے وقفے سے جب گھنٹی تین بار بیچ چُکی تو قریشی صاحب نے مائیکرو فون والا سوچ کھول کے بگل کی

طرح تین بار مُنہ سے سیٹی بجائی۔

ایک لمحے بعد دوسری طرف سے ایک رُعب دار آواز آئی۔ "عامِل، میں جِنوں کا بادشاہ ہوں۔ عامل، سامنے آؤ۔ میں جِنوں کا بادشاہ ہوں۔ عامل سُن رہے ہو میری آواز؟"

"ہاں سُن رہا ہوں۔ تمہارے سامنے ہوں۔ بولو۔ کیا کہتے ہو؟" اظہر قریشی ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولے۔

"ہوں۔ کہو، دیکھیں میری کرامت، ڈر تو نہیں گئے؟" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ہُنھ۔ نقلی سانپ کو کرامت کہتے ہو؟ اِس سے تو میرے بچّے بھی نہیں ڈرے۔"

"یہ بات ہے۔ اچھّا۔ اب میں تمھیں سچ مُچ کے سانپوں سے آزماؤں گا۔"

"کوئی پروا نہیں۔ میں زندگی بھر سانپوں سے کھیلتا رہا ہوں۔" اظہر قریشی نے جواب دیا۔

"تو فوراً دو سانپوں سے نبٹنے کے لیے تیّار ہو جاؤ۔ یاد رکھنا، یہ ایسے ویسے سانپ نہیں ہوں گے۔ اِن میں ایک لانٹرن قبیلے کے سپیروں کو، دوسرا 'فُران قبیلے' کے سپیروں کو عاجز کرچکا ہے۔"

"میں تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں۔ میں اِن سانپوں کو مٹکے میں بند کر کے تمہیں تُحفے کے طور پر بھیج دوں گا۔ سمجھے جِنوں کے بادشاہ۔"

"اچھّا ہوشیار ہو جاؤ۔ یہ سانپ ہوائی جہاز کی طرح اُڑ کر آ رہے ہیں۔"

"میں تیّار ہوں۔ نکال لو حوصلے۔" اظہر قریشی نے جواب دیا۔

"سنبھالو۔ وہ آئے۔"

"پروا نہیں۔ آنے دو۔"

اِس مُکالمے کے بعد دوسری جانب سے ایسی آواز آئی جیسے غصّے کے ساتھ کسی نے میز پر مُکّا مارا ہو۔ جواب میں اظہر قریشی نے بھی میز پر مُکّا جمایا اور اِس کے بعد یہ سِلسِلہ ختم ہو گیا۔ پرویز اور جاوید پھٹی پھٹی نگاہوں سے ڈیڈی کو گھُور رہے تھے جن کے چہرے سے فِکر یا غصّے کے بجائے خُوشی جھلک رہی تھی۔ ہیم کا سوئچ بند کر کے وہ جاوید اور پرویز پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولے۔

"ہاں بھئی، کہو کیا سمجھے؟ ارے، یہ تم دونوں ہونّق کیوں ہو رہے ہو؟"

"یہ معاملہ کیا ہے؟" جاوید نے پوچھا۔

"ہار گئے؟ خود کُچھ نہیں سمجھ سکتے۔" ڈیڈی نے کہا اور پھر سمجھاتے ہوئے بولے۔ "اگر تُم یہ اُمّید کرتے رہے کہ کوئی تمھیں راز بتا دیا کرے گا تو زندگی بھر تم اچھّے سُراغ رساں نہیں بن سکتے۔"

"او کے۔" جاوید نے کہا۔ پرویز بھی چھت کو گھُورنے لگا جیسے کُچھ سوچ رہا ہو۔ اظہر قریشی مُسکراتے ہوئے اس طرح دونوں کو تکنے لگے جیسے اُن کی ہمّت بڑھا رہے ہوں۔

"ایک بات میں سمجھ گیا۔" جاوید نے کہا۔ سانپ اِس بات کا اشارہ تھا کہ ریڈیو پر آپ کو کوئی اہم پیغام دیا جانے والا ہے۔ کیسے ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔ آگے چلو۔" اظہر قریشی بولے۔

"یہ بات میں ابھی سوچ رہا ہوں کہ ریڈیو پر آپ سے جس شخص نے بات چیت کی ہے وہ آپ کا دوست ہے یا دُشمن؟" ایک لمحہ رُک کر جاوید نے کہا۔ "اگر دوست ہے تو دھمکیوں کے انداز میں بات چیت کیوں ہوئی ہے؟ اور اگر دُشمن ہے تو اُس بات چیت کے بعد غصّے یا فکر کے بجائے آپ کے چہرے پر خوشی کی چمک کیوں ہے؟"

"میں بتاؤں؟" پرویز نے کہا۔ "بات کرنے والا ڈیڈی کا دُشمن ہرگز نہیں ہے۔ دونوں ڈراما بول رہے تھے۔"

"شاباش۔ شاباش!" اظہر قریشی ہنستے ہوئے بولے۔ "مگر بات چیت کا مطلب تو نِکالو۔" "جنوں کے بادشاہ نے۔" جاوید کہنے لگا۔ "دو ایسے سانپوں کی دھمکی دی ہے جن سے لانٹرن اور فران قبیلے کے سپیرے عاجز آ چُکے ہیں۔ بس میں اِس سے زیادہ اس بات چیت کا کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا۔" جاوید نے اظہر قریشی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاہاہا۔" اظہر قریشی قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔ "ذرا اور سوچو اِس سے تو کوئی مطلب نہ نکلا۔ اچھّا اگر میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میں تھوڑی ہی دیر میں ہوائی جہاز سے راولپنڈی جانے والا ہوں تو تُم کیا سمجھو گے؟"

"کیا یہ دوسرا شخص راولپنڈی سے بول رہا تھا؟" جاوید نے سوال کیا۔

"ہُوں۔" اظہر قریشی نے کہا۔

"تو پھر میں اس کی دھمکی کو بُلاوا اور جِنوں کے بادشاہ کو آپ کا افسرِ اعلیٰ سمجھوں گا۔"

"شاباش شاباش۔ اب سانپوں اور لانٹرن اور فُران قبیلوں کا مطلب بتاؤ۔"

"سانپوں کا مطلب؟" جاوید نے آنکھیں بند کر سوچتے ہوئے کہا۔ "دو سانپوں کا مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ دو خطرناک گروہوں کی تحقیقات کا معاملہ آپ کے حوالہ کیا جائے گا مگر یہ لانٹرن اور فُران قبیلے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آئے۔ جاوید نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"شاباش۔ سانپوں کے بارے میں تُم نے ٹھیک کہا۔ لانٹرن اور فُران قبیلوں کی بات واقعی تمہاری سمجھ سے باہر ہے۔ یہ میں بتائے دیتا

ہوں۔ ” اظہر قریشی پیار کی نگاہوں سے جاوید کو دیکھتے ہوئے بولے۔

” دیکھو لانٹرن سے لفظ ’انٹرنل‘ بنتا ہے اور فُران سے ’فارن‘ قبیلوں سے مراد وزارت یا محکمہ ہے۔ پوری بات سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ ایک پُر اسرار خُفیہ گروہ سے محکمۂ داخلہ اور دوسرے خُفیہ گروہ سے محکمۂ خارجہ پریشان ہے۔ اِن دونوں کے بارے میں تحقیقات میرے حوالے کی جاتی ہے اور معاملہ اتنا اہم ہے کہ مُجھے فوراً طلب کیا گیا ہے۔ “

"اوہ ڈیڈی۔ پھر تو بڑا مزہ آئے گا۔ ہم بھی آپ کے ساتھ کام کریں گے۔ " پرویز خوش ہو کر بولا۔

جاوید کو اِس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ وہ لانٹرن اور فُران لفظوں سے خود یہ مطلب کیوں نہ نکال سکا۔ پہلے لفظ میں حرف ”ل“ کو شروع کے بجائے آخیر میں کر دینے سے ”انٹرنل“ بن جاتا ہے اور دُوسرے لفظ میں ”ا“ کو ”ر“ سے پہلے کر دینے سے لفظ ”فارن“ بن جاتا ہے۔

"تُم ناکامی کا افسوس کر رہے ہو؟" اظہر قریشی جاوید کے دِل کی بات بھانپتے ہوئے بولے۔ "کوڈ لفظوں کے فوراً معنی نہ سمجھنا کوئی ایسی خاص ناکامی نہیں۔ اچھّے اچھّے سُراغ رساں چکرا جاتے ہیں۔" پھر اُنہوں نے جاوید کو تسلّی دی۔ "دوسری باتوں کے بارے میں تو تمہارا خیال ٹھیک نکلا ہے۔"

"آپ ہمیں بُدھو تو نہیں سمجھتے؟" پرویز نے کہا۔

"نہیں بیٹا۔ میں تُم پر فخر کرتا ہوں۔ تم بہت ذہین اور سمجھدار ہو۔"

"تو پھر۔" جاوید بولا۔ "اِن سانپوں کی تحقیقات میں آپ ہمیں بھی شامل کریں گے نا؟"

"دیکھا جائے گا۔" اظہر قریشی اُٹھتے ہوئے بولے۔ "اب چلو کھانے سے نپٹ لیا جائے۔ مجُھے ابھی جانا ہے۔ تُم کل صُبح جا کر نیلام میں سے پسند

کے جانور لے آنا۔ پتا شام کے اخبار میں ہے۔ کار میں رکھا ہے۔ پیسے امّی سے لے لینا۔“

فائرنگ

بُھس بھرے جانوروں کا نیلام الیاس منزل میں ٹھیک صُبح دس بجے شروع ہونا تھا۔ یہ بنگلا پی ای سی ایچ سوسائٹی میں تھا۔ جاوید اپنے اسکوٹر پر گھر سے ٹھیک ۹:۳۰ بجے نکلا۔ پرویز اس کے ساتھ تھا۔ دونوں بھائی پندرہ منٹ تک اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہے مگر بنگلا نہیں ملا۔ اب اُن کے سامنے تین ہی راستے رہ گئے تھے۔ اِسی طرح بھٹکتے رہیں، تلاش ترک کر کے گھر واپس ہو جائیں یا پوسٹ آفس یا تھانے سے پتا حاصل

کرنے کی کوشش کریں۔ فیروز آباد کا پولیس تھانہ قریب تھا۔ اُنھوں نے وہیں جانا مُناسب سمجھا۔

تھانے کے صحن اور برآمدے میں خاصی چہل پہل تھی۔ اسکوٹر برآمدے کی سیڑھی کے قریب کھڑا کر کے وہ سیدھے ڈیوٹی روم پہنچے۔ یہاں کئی اے ایس آئی اور جمعدار بیٹھے کُچھ لکھ رہے تھے۔ چند کانسٹیبل اُن کے اِرد گرد کھڑے تھے۔ ایک نوجوان اے ایس آئی کو خالی دیکھ کر یہ سیدھے اُس کی میز پر پہنچے۔

"جناب! یہ الیاس منزل کہاں ہے؟ ہم بہت دیر سے ڈھونڈ رہے ہیں۔ پتا نہیں چلتا۔"

"الیاس منزل؟" اے ایس آئی اُنہیں غور سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "آپ اُس الیاس شیخ کا تو نہیں پوچھ رہے۔ جس نے کوئی ڈیڑھ مہینے ہوئے خُودکُشی کرلی تھی؟"

"خُودکشی؟" جاوید نے حیران ہوکر کہا۔ "جناب، ہم اُس الیاس منزل کا پتا پوچھ رہے ہیں جہاں آج نیلام ہے۔"

"ہاں ہاں۔ یہ وہی الیاس ہے۔ وہ بھُس بھرے جانور بنایا کرتا تھا۔ "اے ایس آئی نے کہا۔ پھر اُس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ تھانے کی پچھلی جانب چلے جائیے۔ بنگلوں کی قطاریں ختم ہو جائیں تو چاروں طرف نگاہ ڈالیے۔ آپ کے سامنے بہت سے کھُلے پلاٹ، ٹیلے اور کچُھ بنگلے ہوں گے۔ اُن میں پتھرّوں کی اونچی چار دیواری والا جو بنگلہ نظر آئے وہی الیاس منزل ہے۔"

"اگر الیاس نے خُودکشی کرلی تو یہ نیلام کون کرارہا ہے؟" جاوید نے اچانک سوال کیا۔

"اُس کی بیوی کرارہی ہوگی۔ "اے ایس آئی نے جواب دِیا۔

”مگر میں کہتا ہوں صدیقی صاحب۔ “ ایک جمعدار بولا۔ ”مُجھے اب بھی یہ خُود کشی کے بجائے قتل ہی کا کیس معلوم ہوتا ہے۔ “

”خُود کُشی سے پہلے اُس نے پولیس کے نام چٹھی لکھی تھی کہ میں دُنیا سے بیزار ہو کر خُود کُشی کر رہا ہوں۔ “

جاوید اور پرویز اے ایس آئی کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل گئے۔ چند منٹ بعد اُن کا اسکوٹر الیاس منزل کے پھاٹک کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ لیکن یہ شاید تھانے کے اندر سُنی ہوئی باتوں کا اثر تھا کہ اب اُن کے چہروں پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ الیاس، اُس کی موت، اُس کی بیوی، نیلام، بنگلے کی چار دیواری، غرض ہر چیز اُنہیں پُر اسرار سی لگ رہی تھی۔ وہ اُن میں سے ہر چیز پر غور کر رہے تھے اور یہ ساری چیزیں اُنہیں کسی گہرے راز کا تانا بانا محسوس ہو رہی تھیں۔ جانے کیوں رہ رہ کر اُن کے دل میں یہ خیال آ رہا تھا کہ کُچھ اور بھی حیرت انگیز واقعات ہونے والے ہیں۔

بنگلے کے اندر زیادہ بھیڑ تو نہ تھی لیکن رونق ضرور تھی۔ آمد و رفت کے لیے چار دیواری کے دونوں کونوں پر دو گیٹ تھے جن میں سے ایک بند تھا۔ دس فٹ چوڑا ایک پُختہ راستہ بنگلے کی برساتی کے نیچے سے ہوتا ہوا دونوں پھاٹکوں سے گزرتا تھا اور اس کے درمیان میں ایک کُشادہ لان تھا۔ برساتی کی سیدھ میں چار دیواری سے ملا ہوا ایک گیراج تھا۔ چند ایک آدمی یہاں بھی مصروف دکھائی دے رہے تھے لیکن زیادہ رونق لان میں تھی جہاں شامیانوں کے پیچھے ایک سِرے پر تخت بچھا ہوا تھا اور تخت کے وسط میں اُدھیڑ عُمر کا ایک گنجا سا آدمی میز پر بیٹھا تھا۔ دو آدمی اُس کے دائیں بائیں کھڑے تھے جن میں سے ایک اِس وقت کوئی چیز اُٹھائے ہوئے بولی دُہرا رہا تھا۔

تخت کے نیچے فرنیچر اور دوسری گھریلو استعمال کی چیزیں رکھی تھیں اور اُن سے پرے خریداروں کے لیے کُرسیاں بچھی تھیں۔ کُچھ لوگ کھڑے

ہوئے تھے۔

جاوید اور پرویز شامیانے کے نیچے پہنچے تو اُنھیں نیلام کی جانے والی چیزوں کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ ایک کالی بِلّی اور نیولے کے علاوہ کوئی اور بُھس بھرا جانور وہاں دِکھائی نہ دیتا تھا۔

"ایک۔ دو۔ دس روپے۔ لیمپ کے دس روپے۔ کوئی گیارہ روپے ہے؟" نیلام کرنے والا بول رہا تھا۔

جاوید اور پرویز کی نگاہیں بِلّی اور نیولے پر لگی ہوئی تھیں۔ بولی بولنے والے نے ایک دو تین کہہ کر دس روپے میں ٹیبل لیمپ کی بولی ختم کی تو جاوید بولا۔

"بِلّی اور نیولے کے علاوہ اور جانور نہیں ہیں؟"

"جی وہ بِک چکے ہیں۔ آپ دیر سے تشریف لائے ہیں۔" بولی والا بولا۔

"اچھّا اِنھی کو اُٹھائیے۔" پرویز نے کہا۔

میز کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے مُسکرا کر اشارہ کیا۔ بولی بولنے والے نے بِلّی اور نیولا اُٹھا لیا اور جاوید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں بھائی کتنا؟"

"دس روپے۔" جاوید نے بولی لگائی۔

"گیارہ روپے۔" ایک دوسرا آدمی بولا۔

"بارہ روپے۔" جاوید نے جھٹ سے کہا۔

بولی بڑھتی رہی اور آخر پچیس پر ختم ہو گئی۔ آخری بولی جاوید کی تھی۔ نیلام والے نے کہا۔ "اگر پیکنگ کرانی ہو تو گیراج میں لے جاؤ۔" مگر جاوید نے پیسے دے کر دونوں جانور ایسے ہی لے لیے۔ پھر دوسری چیزوں کا نیلام دیکھنے کے لیے اُنھوں نے خریدے ہوئے جانور ایک کرسی پر رکھ دیے

اور تخت کی طرف دیکھنے لگے۔

اب نیلام والا ایک ٹائم پیس کی بولی لگا رہا تھا کہ بھورے رنگ کی ایک بڑی سی کار پھاٹک کے اندر آئی۔ دراز قد، ہلکے جسم اور لمبوترے چہرے والا ایک شخص رنگین چشمہ لگائے اور پیشانی کو ہیٹ سے چھپائے ہوئے کار سے اُتر کہ شامیانے کے قریب آیا۔ اُس نے ایک کونے میں کھڑے ہو کر ساری چیزوں کا جائزہ لیا اور پھر کرخت سی آواز میں نیلام والے سے پوچھنے لگا۔

"بھُس بھرے جانور کہاں ہیں؟"

"وہ بِک چکے ہیں۔ گیراج میں پیک ہو رہے ہیں۔" بولی پُکارنے والے نے جواب دیا۔

یہ سُن کر وہ شخص گیراج کی طرف چل دیا۔ اُس کے جاتے ہی پرویز نے

جاوید کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"چلو بھائی چلیں۔ کہیں یہ آدمی ہماری بِلّی اور نیولے کے پیچھے نہ پڑ جائے۔"

جاوید نے چونکتے ہوئے کہا۔ "ہاں چلو۔ اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔"

یہ کہہ کر دونوں بھائی باہر چل دیے۔ پرویز نے بِلّی اُٹھا لی اور جاوید نے نیولا۔ شامیانے کے باہر لان ہی میں اُس کا اسکوٹر کھڑا تھا۔ یہاں جاوید نے بِلّی بھی پرویز کے حوالے کر دی۔ پرویز اُنھیں اِس طرح پیٹ سے چمٹائے ہوئے تھا جیسے کوشش کر رہا ہو کہ اُنھیں کوئی دیکھ نہ لے۔

لان سے گزر کر جاوید نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا لیکن ابھی پرویز پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک شور بُلند ہوا۔ پکڑو۔ روکو چور چور۔"

جاوید نے پلٹ کر شور مچانے والوں کو دیکھنا چاہا مگر گردن گھُماتے ہی اُس کے اوسان خطا ہو گئے۔ بھورے رنگ کی کار اتنی تیزی سے اسے اپنے قریب پہنچتی ہوئی محسوس ہوئی جیسے بس اب کُچل ہی ڈالے گی۔ اُس نے پوری رفتار سے اسکوٹر کو لان کی طرف موڑ کر ایک درخت کی اوٹ میں کر لیا۔ اچانک اور تیز جھٹکے کے ساتھ اسکوٹر کے آگے بڑھنے کی وجہ سے پرویز پیچھے کو اُٹھا۔ اگر وہ کہیں سڑک پر گِرتا تو کار کے اگلے پہیّے کے نیچے گِرتا۔ مگر جاوید نے درخت کی اوٹ میں جانے کے لیے اسکوٹر کو جو موڑا تو وہ جھول کر دوسری طرف لان پر چاروں شانے چِت گِرا۔ بِلّی اور نیولے کو وہ اب بھی سینے سے چمٹائے ہوئے تھا۔

اُسی لمحے برساتی کی جانب سے پستول کے فائر کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر اچانک کار کے بریک چیخ اُٹھے اور چند گز چلنے کے بعد وہ رُک گئی۔ چشمے والا وہ شخص جس نے کُچھ دیر پہلے نیلام کرنے والے سے جانوروں کے

بارے میں پُوچھا تھا۔ ڈرائیور کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔ غصّے سے اُس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ فائرنگ کی پروا کیے بغیر پرویز کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے کار کا دروازہ کھولا۔ لیکن وہ نکلنا ہی چاہتا تھا کہ برساتی کے کھمبے کی اوٹ سے ایک اور گولی آئی اور وہ شخص کار کے اندر ہی دُبک گیا۔

پُراسرار واقعات

چور چور کے شور کا بند ہونا، بھُوری کار کا بے تحاشا بھاگنا، پھر فائرنگ کی آوازوں کے باوجود اُس کا رُک جانا، چشمے والے شخص کا اُترنے کی نیّت سے کار کا دروازہ کھولنا، یہ ساری باتیں ایک ایک کر کے اتنی تیزی کے ساتھ ہوئیں کہ جاوید کُچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

فائر کی پہلی آواز کے ساتھ گولی کار سے اوپر سڑک کی بغلی چار دیواری سے ٹکراتی محسوس ہوئی تھی۔ دوسری آواز کے ساتھ کار سے کئی گز پیچھے سڑک

کے بیچ میں ایک جگہ سے کُچھ مٹّی اور کنکر اُڑتے دکھائی دیے تھے۔ تیسری گولی پھر دیوار پر جا لگی تھی۔ اس سے جاوید کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ فائر کرنے والا جو بھی ہے نشانے کا کچّا ہے۔ اِسی خیال سے اسکوٹر چھوڑ کر وہ درخت سے اِس طرح چمٹ گیا تھا کہ گولیوں سے محفوظ رہے۔ اُس نے پرویز کو بھی چیخ چیخ کر دوسرے درخت کی اوٹ میں چھُپ جانے کے لیے کہا۔ لیکن پے در پے ہونے والے ان واقعات نے پرویز کے ذہن کو کُچھ ایسا سُن کر دیا تھا کہ وہ جس طرح گرا تو اُسی طرح لیٹا ہوا آنکھیں پھاڑے کبھی برساتی کی طرف اور کبھی کار کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

یہ وہ وقت تھا کہ جب چشمے والا کار کا دروازہ کھول کر نیچے اُترنا چاہتا تھا۔ اور اُس کی نگاہیں پرویز کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ عین اُسی موقع پر برساتی کی طرف سے فائر کی چوتھی آواز آئی اور گولی کار کی ڈگّی ہیں آ لگی۔ چشمے والے نے سڑک پر اپنا رکھا ہوا قدم پھر کار میں رکھ لیا دوسرے ہی لمحے اُس کا

ایک ہاتھ باہر تھا جس میں بڑا سا خوفناک ریوالور دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک اُس کی نالی پیچھے کی طرف گھومی اور زوردار دھماکے کے ساتھ اس میں سے ایک شُعلہ نکلتا دکھائی دیا۔ وہ اچھّا نشانہ باز معلوم ہوتا تھا۔ گوئی سیدھی اُسی کھمبے سے ٹکرائی جس کے پیچھے سے کار پر فائر کیا جا رہا تھا۔ جواب میں کھمبے کی اوٹ سے ایک گولی آئی اور اسے اتّفاق ہی کہیے کہ وہ ٹھیک کار کے کھُلے ہوئے دروازے سے آ ٹکرائی۔ چشمے والے شخص نے بپھر کر پھر ایک گوئی چلائی اور کار کو آگے بڑھانے کا اِشارہ کیا۔ ایک ہی فرّاٹے میں کار پھاٹک سے باہر تھی۔

کار کے غائب ہوتے ہی برساتی میں چھُپا ہوا شخص باہر نکل آیا۔ یہ وہی گنجا سا تھا جو تخت پر بیٹھا تھا۔ کھمبے کی اُوٹ سے نکل کر وہ پھاٹک کی طرف بڑھنے لگا۔ جاوید نے لپک کر پرویز کو جھنجھوڑ کر اُٹھایا اور اُس سے پوچھنے لگا۔

"کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں۔ مگر یہ کیا ہو رہا ہے؟" پرویز نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے جاوید کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔" جاوید نے سکوٹر سنبھالتے ہوئے کہا۔ "چلو کار والے کا پیچھا کریں۔"

"چلو۔ مگر دُور دُور رہنا۔ اُس کے پاس ریوالور ہے۔" پرویز بولا اور بِلّی اور نیولے کو سنبھالتے ہوئے پیچھے کی سیٹ پر بیٹھنے لگا۔ اتنے میں نیلام کا منتظم بھی اُن کے پاس پہنچ گیا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا۔ پھاٹک کے باہر سُنسان سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے پرویز سے پوچھا۔

"بیٹے، تمھیں چوٹ تو نہیں آئی۔"

"جی نہیں۔ معمولی سا دھکّا لگا تھا۔" پرویز نے جواب دیا۔

"یہ کون لوگ تھے؟" جاوید نے اُس شخص کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ڈاکو ہیں۔ بھاگ گئے مردُود۔ گیراج سے زبردستی نیلام شُدہ جانور لے گئے ہیں۔" اُس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"کتنے جانور تھے؟" جاوید نے سوال کیا۔

"نوادر وہ الیاس صاحب کے بہترین شاہکار تھے۔"

"کیا قیمت ہوگی اُن کی؟" جاوید نے پوچھا۔

"دو ہزار روپے ہوگی۔ ڈیڑھ ہزار میں نیلام ہوتے تھے۔" اُس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"تو کیا یہ لوگ اتنے روپے دے کر خرید نہیں سکتے تھے؟"

"گیراج میں ہمارے آدمی کو دو ہزار روپے دے رہے تھے مگر جس نے بولی دی تھی وہ نہیں مان رہا تھا۔"

"تب تو یہ واردات اُنہوں نے شاید غصّہ میں کی ہے۔ " جاوید نے کہا۔

"مگر اُنہیں غصہ کرنے کا کیا حق ہے۔ خریدنے کے شوقین تھے تو وقت پر آ کر خرید لیتے۔ دیر سے کیوں آئے؟ یہ شخص ضرور کوئی ڈاکو ہے۔ صرف غُصّے میں آ کر اتنی بڑی واردات کوئی نہیں کرتا۔ نشانہ کتنا سچّا ہے کم بخت کا۔ "

"مگر آپ نے یہ پانچ فائر کس چیز کو نشانہ بنا کر کیے تھے؟ " جاوید نے مُسکرا کر کہا۔

"میں۔ میں دراصل کار کے ٹائروں کو پھاڑنا چاہتا تھا مگر کیا کروں میرا نشانہ اچھّا نہیں۔ "

"نہیں جناب۔ کوئی اور بھی بات ہے۔ " جاوید نے کہا۔ "بھاگتی کار میں اگر آپ کے دو فائر بے کار گئے تو کوئی بات نہیں لیکن اُس کے کھڑے ہو

جانے کے بعد آپ نے جو تین فائر کیے اُن میں سے ایک بھی ٹائروں کے اردگرد نہیں لگا۔ آپ گھبرائے ہوئے بھی تھے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں گھبرا گیا تھا۔ بات ہی کُچھ ایسی تھی۔"

"ویسے میرا خیال ہے کہ آپ مرحُوم الیاس کی بیوہ کے مینجر ہیں۔ ہیں نا۔" جاوید نے اِکبارگی کہا۔

"آپ ٹھیک سمجھے۔ اور آپ؟"

"ہم دونوں بھائی ہیں۔ ہمارے والد اظہر قریشی صاحب ریٹائرڈ ایس پی ہیں۔" جاوید نے کہا۔

"اوہ تبھی آپ اتنے نڈر ہیں۔ آپ لوگوں سے مل کر مُجھے بڑی خوشی ہوئی۔" مینیجر بولا۔

"اچھّا۔ اس خوشی میں ایک بات بتائیے۔" جاوید نے مُسکرا کر کہا۔ "کیا

آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ مرحوم الیاس نے خودکشی کی تھی؟"

"مینجر یہ سُن کر سنّاٹے میں آگیا۔ مگر پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

"اس سوال کا اب کیا موقع ہے؟ آپ نہیں جانتے کہ گزشتہ ہفتے پولیس اِس سِلسلے میں اپنی تحقیق مکمّل کر چکی ہے اور وہ یہ تسلیم کر چکی ہے کہ مرحوم نے خودکشی کی تھی۔"

"معاف کیجیے گا۔ آپ شاید بُرا مان گئے۔ میں تو آپ کی رائے جاننا چاہتا تھا۔ پولیس کی نہیں۔"

"ٹھیریے۔ کیا یہی سوال میں آپ سے کر سکتا ہوں ہے؟"

"جی ہاں۔ بڑے شوق سے۔ میں بُرا نہیں مانوں گا۔" جاوید نے کہا۔ "اگر آپ میری رائے جاننا چاہیں گے تو میں صاف صاف کہوں گا کہ الیاس شیخ کو قتل کیا گیا ہے۔"

مینجر کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ چند منٹ وہ جاوید کو تکتا رہا پھر رُک رُک کر بولا۔

"آپ بہت بڑی بات کہہ رہے ہیں۔ بغیر ثبوت کے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔"

"جناب، وقت آنے پر ثبوت بھی مہیّا کیا جائے گا۔ مگر خیر چھوڑیے۔ یہ بتائیے ڈاکوؤں نے کار کیوں روکی تھی اور وہ بھی گولیوں کی بوچھاڑ میں؟" جاوید نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"میں خود حیران ہوں۔ جب تک کار دوبارہ نہیں بھاگی، میں یہی سمجھتا رہا کہ میری دوسری گولی سے اس کا کوئی نہ کوئی ٹائر پھٹ گیا ہے۔ اچھّا، مُجھے ابھی بہت سا سامان نیلام کرنا ہے۔ ساتھ ہی پولیس کو بھی اِطّلاع کرنی ہے۔ آپ اپنا ٹیلی فون نمبر بتا دیجیے۔ میرا نمبر اِس کارڈ میں ہے۔"

الیاس منزل سے نکلتے ہی جاوید نے اپنی ساری توجّہ راستے اور سواریوں کی طرف کر دی اور اپنے ذہن کو بالکل آزاد کر دیا۔ وہ اپنے والد کی اِس نصیحت پر سختی سے عمل کیا کرتا تھا کہ گاڑی چلاتے وقت ٹریفک پر توجّہ دینے کے علاوہ اور کوئی بات نہیں سوچنی چاہیے۔

پرویز کا معاملہ اُس سے مختلف تھا۔ وہ پیچھے بیٹھنے کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ تھانے میں سُنی ہوئی باتوں سے لے کر گنجے منیجر سے رُخصت ہونے تک کی ساری باتیں اُس کے دماغ میں چکّر لگا رہی تھیں۔ ایک ایک بات پر وہ اتنی گہری توجّہ سے خود کر رہا تھا کہ اُسے اردگرد کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔ مُمکن ہے کُچھ دیر اور وہ اسی طرح سوچ میں ڈوبا رہتا مگر ایک مقام پر اپنے پیچھے کئی کاروں کے بریکوں کی اچانک چیخوں سے وہ چونک پڑا۔ پھر وہ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے چلّا اُٹھا۔ ”ارے بھائی۔ اِدھر کہاں، شہیدِ مِلّت روڈ سے نکل لیتے نا۔“

"ذرا خان چچا کے پاس چلیں گے۔" جاوید نے جواب دیا۔

لیکن خیام سنیما کے سامنے سڑک سے بائیں طرف مُڑ کر ان کا اسکوٹر کچّے پر دوڑنے لگا۔ پرویز کے لیے یہ بات پہلے سے بھی زیادہ حیرت ناک تھی مگر قبل اِس کے کہ وہ جاوید سے کُچھ پوچھتا، ایک ہوٹل کے سامنے پہنچ کر اسکوٹر رُک گیا۔

"آؤ۔ ذرا کُچھ پی لیں۔ حلق خشک ہو رہا ہے۔" جاوید نے اسکوٹر سے اُترتے ہوئے کہا۔

"ہاں واقعی۔" پرویز نے جواب دیا۔ "اب اُسے بھی اپنی پیاس کا احساس ہو رہا تھا۔"

ہوٹل میں داخل ہو کر اُنھوں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر ایک خالی میز کی طرف چل دیے۔ اس کے گرد چار کرسیاں تھیں جن میں سے ایک پر

اُردُو اخبار رکھا ہوا تھا۔

"بھائی۔ یہ تُم نے الیاس کے قتل والی بات کِس لیے کہی تھی؟" ایک کرسی پر بلّی اور نیولے کو رکھتے ہوئے پرویز نے کہا۔

"بس اچانک سُوجھ گئی۔" جاوید نے سامنے کی کُرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں نے سوچا ذرا اندھیرے میں تیر پھینک کے دیکھوں۔" "دو مِلک شیک۔" ٹیبل والے کو قریب پُہنچتے دیکھ کر جاوید نے اُس کی طرف مُنہ کر کے اُونچی آواز سے کہا اور پھر پرویز سے کہنے لگا۔ "نیلام میں چشمے والے کی بات سُن کر تمھیں یہ ڈر کیوں ہوا تھا کہ کہیں وہ بِلّی اور نیولے کے پیچھے نہ پڑ جائے۔" یہ کہہ کر اُس نے نگاہیں اُس شخص پر جما دیں جو ابھی ایک رکشے سے اُتر کر ہوٹل میں آیا تھا اور کاؤنٹر کے پاس رُک کر چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا۔

"بس یونہی مُجھے دھڑکا ہو گیا تھا کہ کہیں اُس نے ہمارے خریدے ہوئے

جانوروں کو دیکھ لیا تو۔ "پرویز اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ایک شخص کو قریب کھڑا پا کر خاموش ہو گیا اور بِلّی اور نیولے کو اُٹھا کر جلدی سے اپنی گود میں رکھ لیا۔

یہ وہی شخص تھا جو کاؤنٹر کے پاس کھڑا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے اس نے کرسی پر رکھے ہوئے جانوروں نگاہ ڈالی اور پھر سامنے والی خالی کرسی کو غور سے دیکھتا ہوا اُن کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کرسی پر ایک اخبار پڑا تھا جسے اُس شخص نے اُٹھا لیا اور کھڑے کھڑے اُس پر نگاہیں دوڑانے لگا۔

"ہوٹل کا بیرا اِس عرصے میں مِلک شیک کے دو گلاس اُن کی میز پر آ کر رکھ گیا تھا۔ دونوں خاموشی کے ساتھ ملک شیک کی چُسکیاں لینے لگے مگر ان کی نظریں اُس پُراسرار شخص پر تھیں۔

وہ اپنے گلاس آدھے بھی نہ ختم کر پائے تھے کہ اُس شخص نے اخبار کو لپیٹ کر تہہ کیا اور پھر پہلے کی طرح خالی کرسی پر رکھ کر تیزی سے ہوٹل سے

باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی وہ اُس رکشے پر جا بیٹھا جس میں آیا تھا اور رکشا ہوا ہو گیا۔

"اِس اخبار میں ضرور کوئی خاص بات ہے۔" جاوید نے پرویز سے کہا۔ "یہ شخص یہاں اِسی لیے آیا تھا۔" پھر کُرسی سے اخبار اُٹھا کر میز پر پھیلاتے ہوئے بولا۔ "میں یقین سے کہتا ہوں کہ اُس نے ایک بھی خبر پوری نہیں پڑھی۔ بس اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا ہے۔ لیکن جاتے وقت اُس کے چہرے پر جو اطمینان تھا اُس سے پتا چلتا ہے کہ جو چیز وہ دیکھنا چاہتا تھا وہ اخبار میں موجود ہے۔"

"یہ بعض خبروں پر سُرخ چوکھٹے کیسے ہیں؟" پرویز اخبار پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

جاوید چونک پڑا۔ اُس کی نگاہوں میں ایک خاص چمک آ گئی۔ جلد جلد اخبار کو اُلٹ پلٹ کر اُس نے دیکھا۔ ہر صفحے پر کسی نہ کسی بیان، خبر اور مضمون

کے گرد سُرخ بال پن سے حاشیے بنائے گئے تھے۔ جب اُس نے اُن حاشیوں کے اندر کی عبارت کو پڑھا تو کُچھ دیر کے لیے سنّاٹے میں آگیا۔ ان سب میں مُلک کی سیاسی جماعتوں کے لوگوں کے درمیان نفرت اور تعصب کے جذبات بھڑکانے کی کوشش کی گئی تھی۔

جاوید کے لیے یہ بات نئی نہ تھی۔ اس قسم کی خطرناک باتوں کا سِلسِلہ کئی ماہ سے جاری تھا اور روز بروز ترقّی ہی کرتا جارہا تھا مگر ایسی خبروں اور بیانات کے گرد سُرخ حاشیے اس نے پہلی مرتبہ دیکھے تھے۔ خاص طور پر ہوٹل کے اخبار میں ان حاشیوں کا ہونا اسے اور بھی زیادہ پُراسرار لگ رہا تھا۔ اِس کا مطلب پڑھنے والوں کو اُن کی طرف توجّہ دِلانا تھا طرح طرح کے سوالات اُس کے دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔ اچانک بِجلی کی سی تیزی سے ایک عجیب سوال اُس کے ذہن میں اُبھرا۔

“کیا پُراسرار شخص یہی دیکھنے کے لیے آیا تھا کہ اخبار میں یہ نشانات لگے

ہوئے ہیں کہ نہیں؟" یہ سوچتے ہی اُس نے اخبار تہہ کر کے پھر کُرسی پر رکھ دیا اور مِلک شیک کی چُسکیاں لینے لگا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ دوسری میز سے اُٹھ کر ایک شخص اُن کے قریب آیا اور اخبار اُٹھا کر لے گیا۔ جاوید چونکا۔ اُس نے گلاس ختم کر کے پرویز کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"چلو۔ ابھی چچا خان کے پاس بھی کُچھ وقت لگے گا۔" پرویز نے بِلّی اور نیولے کو سنبھالا اور جاوید کے پیچھے ہو لِیا۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر جاوید نے پیسے دیے اور پھر دونوں بھائی اسکوٹر پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ خُفیہ پولیس کے دفتر میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مِسٹر شوکت علی خان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ یہی اُن کے چچا خان تھے۔ وہ ان کے والد کے گہرے دوست تھے اور کسی زمانے میں اُن کے ساتھ رہ چکے تھے۔

دونوں بھائیوں نے الیاس منزل کی واردات، مجرموں کے حُلیے اور کار کی ہر تفصیل جو اُنھوں نے اپنے ذہن میں محفوظ کی تھی۔ چچّا خان کے سامنے

بیان کر دی اور اب خاموشی کے ساتھ اُن کے جواب کے مُنتظر تھے۔

"بڑی عجیب بات ہے۔" خان صاحب نے کہا۔ "میں نے ساری زندگی میں ایسا کوئی مُعاملہ نہ دیکھا نہ سُنا۔ چند بھُس بھرے جانوروں کے لیے اتنا سنگین جرم کوئی پاگل ہی کر سکتا ہے۔ آپ لوگ بھی تو ماشاء اللہ اپنے ابّا جان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ آپ نے کیا خیال قائم کیا؟"

"میرا خیال ہے۔" جاوید نے حلق صاف کرتے ہوئے کہا۔ "جِس شخص نے یہ واردات کی ہے اُسے بھُس بھرے جانور جمع کرنے کا جنون ہے۔ جِس شخص نے وہ جانور خریدے تھے اُسے وہ پانچ سو روپے زیادہ دے رہا تھا اور۔۔۔۔۔۔"

"بہُت خوب۔" خان صاحب بولے۔

"اور فائرنگ کے باوجود کار روکنے کے بارے میں میرا خیال ہے۔" جاوید

نے ایک لمحہ رُک کر کہا۔ “کہ مجرم نے پرویز کو اس کوٹر سے ِگرتا دیکھ لیا تھا۔ اور اُس کی نظر شاید جانوروں پر پڑ گئی تھی۔ وہ یہ اندازہ کر چکا تھا کہ گولیاں چلانے والا نشانے کا کچّا ہے اور وہ اُس کے اناڑی پن سے فائدہ اٹھا کر پرویز کے ہاتھوں سے جانور لے اُڑے گا۔ یہ خیال مُجھے ابھی آیا ہے۔”

“ہو سکتا ہے۔” چچا خان نے کہا۔ “مگر جب ایک گولی ڈِکّی پر اور دوسری کار کے دروازے پر پڑی تو مُجرم کو اندیشہ ہو گیا ہو کہ گولی چلانے والے کا نِشانہ سنبھلتا جا رہا ہے۔ کہیں کوئی گولی ٹائروں میں نہ جا لگے اِسی لیے اُس نے فرار ہو جاتے ہی میں خیریت سمجھی۔”

“بالکل۔ یہی بات ہو سکتی ہے۔” جاوید نے کہا۔ “میں سمجھتا ہُوں کہ آپ مجرم کو کار کے نمبر اور گولیوں کے نشانات کی مدد سے جلد گرفتار کر لیں گے۔”

"مُمکن ہے۔ "چچا خان نے کہا اور پھر رسیور اُٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگے۔ جاوید اور پرویز جانا چاہتے تھے مگر رُخصت کا اشارہ نہ پا کر کھڑے رہ گئے۔ دوسری طرف چچا خان ٹیلی فون پر کہہ رہے تھے۔

"ہیلو، ہیڈ کوارٹر میں خان بول رہا ہوں۔ کیا کسی شیورلیٹ کار کی چوری کی کوئی رپورٹ آئی ہے؟"

"جی نہیں۔ اِس وقت تک بس دو اسکوٹروں اور کُچھ سائیکلوں کی رپورٹیں پہنچی ہیں۔ "دوسری طرف سے جواب ملا۔

"اچھّا دیکھیے۔ سارے پولیس تھانوں اور ٹریفک سارجنٹوں کو وائرلیس پر ہدایت کر دیجیے کہ بھورے رنگ کی شیورلیٹ کار نمبر XZZ998850 کو جہاں پائیں روک لیں اور ذرا رجسٹریشن آفس سے پتا کر کے مُجھے بتائیے کہ یہ کار کس کے نام رجسٹرڈ ہے؟"

"بُہت اچھّا جناب۔ تھوڑی دیر میں معلُوم کر کے فُون کروں گا؟" دوسری طرف سے ڈیوٹی افسر نے جواب دیا۔

ٹیلی فون رکھتے ہی چچا خان نے دونوں لڑکوں کی طرف دیکھ کر میز کی گھنٹی پر ہاتھ مارا۔ فوراً ایک اردلی داخل ہوا۔ کار کا نمبر ایک چِٹ پر لکھ کر اردلی کو دیتے ہوئے وہ بولے۔

"سُلطان صاحب سے کہو شہر کے تمام موٹر مرمّت کرنے والوں کو ہدایت کر دیں کہ اِس نمبر کی کوئی کار اُن کے یہاں آئے تو ہمیں بتائیں۔" پھر اُنھوں نے لڑکوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بھئی امّی سے کہہ دیا تمھاری چچی آج کل میں آنے والی ہیں۔ خط آیا ہے۔ سلام لکھا ہے۔ اچھّا ہوا تم لوگ آ گئے نہیں تو مجُھے ٹیلی فون کرنا پڑتا۔ اور یہ قریشی صاحب کہاں ہیں۔ دو ہفتے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اُن سے بھی کہہ دینا، دو ایک دِن میں ضرور مل لیں۔"

"اچھّی بات ہے۔" جاوید نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ اور پھر دونوں سلام کر کے باہر آ گئے۔ یہ معلوم کر کے اُنھیں اطمینان ہو گیا تھا کہ اُس وقت تک کار کی چوری کی کوئی رپورٹ نہیں ہوئی۔ اِس کا مطلب تھا کہ واردات خود کار کے مالک نے کی ہے۔ اور اس کا جلد ہی پتا چل جائے گا۔

اب اِس معاملے کی اہمیت اُن کے نزدیک ختم ہو چکی تھی۔ اور وہ جلد سے جلد گھر پہنچنے کی سوچ رہے تھے۔ اُن کا اسکوٹر ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ نیرنگ سینما لالوکھیت کے قریب پہنچے۔ سڑک کے کنارے ایک طرف نظر اٹھاتے ہی الیاس منزل کا سارا منظر جاوید کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ اُس کے دِل کی حرکت تیز ہو گئی اور چہرے پر جوش کی سُرخی دوڑنے لگی۔ ایک دم اُس نے اسکوٹر کی رفتار کم کر دی، جس کار میں مُجرم بھاگے تھے وہ سامنے کھڑی تھی۔ کار سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر بائیں جانب ایک سڑک مُڑتی تھی۔ اُسی طرف مُڑ کر جاوید نے اسکوٹر کھڑا

کردیا۔

سُرخ حاشیے

سیدھے راستے پر گھر جانے کے بجائے یُوں مُڑ کر اسکوٹر کے رُک جانے پر پرویز حیران ہو رہا تھا۔ وہ جاوید سے کُچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ اُس نے اسکوٹر پر بیٹھے بیٹھے گردن گھُما کر کہا۔ ”پرویز اُتر جاؤ۔“

پرویز سیٹ سے اُتر کر جاوید کے سامنے آیا تو اُس نے اور قریب آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مُجرم کی کار کیبنوں کے برابر سڑک کی طرف کھڑی ہے۔ میں اُس کی نگرانی کرتا ہوں اگر کار کسی طرف چلی تو میں اُس کا

پیچھا کروں گا۔ تم رکشے میں گھر چلے جانا اور ہاں، وہ سامنے کیمسٹ کی دُکان ہے۔ تُم وہاں سے خان چچا کو ٹیلی فون کر دو۔"

جاوید کی بات ختم ہوتے ہی پرویز دُکانوں اور کیبنوں کے درمیان کی گلی میں تیزی کے ساتھ داخل ہو گیا۔ کیمسٹ کی دُکان پندرہ بیس قدم پر ہی تھی۔ اُس کے روانہ ہوتے ہی جاوید اسکوٹر گھُما کر نُکّڑ پر لے آیا۔

اچانک جاوید کے بدن میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اُس نے محسُوس کیا کہ کار کیمسٹ کی دُکان کے سامنے والے کیبنوں کے پیچھے ہی کھڑی ہے۔ ہو سکتا ہے مُجرم کیمسٹ کی دُکان میں یا اسی گلی کی کسی دُوسری دُکان میں ہو اور پرویز کے ہاتھوں میں جانور دیکھ کر اُنہیں چھیننے کی کوشش کرے۔ اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ بے چینی اور بے بسی کے ساتھ وہ چونک کر ہر طرف دیکھ رہا تھا اور مُجرم یا اُس کے ڈرائیور کے کار کی طرف آنے یا کسی ہنگامے کا اِنتظار کر رہا تھا۔ اُس کا دِل تیزی

سے دھڑک رہا تھا اور ایک ایک لمحہ پہاڑ بن کر گزار رہا تھا۔ ایک منٹ۔ دو منٹ۔ چار منٹ۔ پورے پانچ منٹ گزر گئے لیکن دونوں میں سے کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ مُڑ مُڑ کر پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی بے چین نگاہیں پرویز کی تلاش میں تھیں مگر گلی سے نکلنے والے ہجُوم میں پرویز کہیں دِکھائی نہ دیتا تھا۔

اچانک کار کی طرف نگاہ اُٹھاتے ہی اُس کا خُون خُشک ہو گیا۔ کیبنوں کے درمیان چھُوٹی ہوئی جگہ سے پرویز باہر نکل رہا تھا۔ بِلّی اور نیولا اُس کے سینے سے چمٹے ہوئے تھے۔ وہ گلی سے آنے کے بجائے اِس طرف سے کیوں آ رہا ہے؟ کیا مُجرم نے اُسے پستول سے دھمکا کر کار کی طرف جانے پر مجبور کیا ہے؟ کیا مُجرم اِس کے پیچھے لگا ہوا ہے؟ اب مُجھے کیا کرنا چاہیے؟ جاوید ابھی اِسی شش و پنج میں تھا کہ پرویز کار سے آگے نکل آیا۔ اُس کے پیچھے کوئی بھی نہ تھا۔ وہ اطمینان کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔

"فُون کر دیا؟" پرویز کے قریب آتے ہی جاوید نے سوال کیا۔

"ہاں چچا کہہ رہے تھے، کوئی چار پانچ منٹ ہوئے اِس کار کی چوری کی رپورٹ ملی ہے۔" پرویز نے کہا۔

"کیا مطلب یہ چار پانچ منٹ پہلے کار چوری ہوئی ہے؟" جاوید نے پرویز کو گھورتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ وہ کہہ رہے تھے رپورٹ ابھی ملی ہے۔ ویسے چوری کوئی ساڑھے دس بجے دِن کے بعد ہوئی ہے۔ اِس کار کا مالک ایک مشہور آدمی ہے اور امپورٹ ایکسپورٹ کی بڑی فرم کا مالِک ہے۔"

"ہُوں۔ تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ واردات کرنے کے بعد مُجرم کار یہاں چھوڑ کر غائب ہو گیا ہے؟" جاوید بڑبُڑایا۔

"ہاں، چچا بھی یہی کہہ رہے تھے۔ پھر بھی اُنہوں نے لالو کھیت کے تھانے

کو کہہ دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں سادہ وردی والے پولیس کے لوگ کار کو گھیرے میں لے لیں گے۔ اگر مجرم نظر آ گیا تو پکڑ لیں گے ورنہ کار تو مل ہی گئی۔" پرویز نے کہا۔

"ہوں، خالی کار میں کیا رکھا ہے۔" جاوید بُڑبُڑایا اور نُکّڑ والے ہوٹل کی طرف چلنے لگا۔ پرویز خاموشی سے اُس کے پیچھے ہو لیا۔ اب اُنہیں پھر پیاس لگ رہی تھی۔ جاوید نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور پھر اسکوٹر ایک جگہ کھڑا کر کے ایک ہوٹل میں داخل ہوئے۔

"دو لیمن لے آؤ۔" بیرا اُن کی میز پر پہنچا تو پرویز نے کہا۔ جاوید اپنے خیالات میں غرق تھا۔

"چچا نے یہ نہیں بتایا کہ کار کیسے چوری ہوئی؟" بیرا میز پر دو بوتلیں رکھ گیا تو جاوید نے آہستہ آہستہ کہا۔

”بتایا تھا۔ کار کے مالک نے اپنے دفتر میں بعض کارخانے والوں اور تاجروں کے آدمیوں کی دس بجے ایک خاص میٹنگ بلائی تھی۔ کسی وجہ سے وہ پورے آدھ گھنٹے دیر سے پہنچا۔ اسی گھبراہٹ اور جلدی میں وہ گاڑی کو تالا لگانا بھول گیا۔ ساڑھے گیارہ بجے میٹنگ ختم ہونے پر جب اُس نے گاڑی غائب پائی تو پولیس کو رپورٹ کی۔“

جاوید لیمن کی چُسکیاں لیتا رہا۔ پھر کُچھ سوچتے ہوئے بُڑبُڑایا۔

”عجیب بات ہے۔ کار کا مالک اپنی بُلائی ہوئی میٹنگ میں لیٹ پہنچا اور مجرم نِیلام میں۔ یعنی اگر کار والا لیٹ نہ ہوتا تو مُجرم بھی وقت پر پہنچتا اور واردات نہ ہوتی۔“

”کیا مطلب؟“ پرویز نے حیرت سے پوچھا۔

”مطلب بالکل صاف ہے۔“ جاوید نے کہا۔ ”یا تو مُجرم خاص طور پر اِسی کار

کا مُنتظر تھا اور یہ اِتّفاق سے اُسے دیر سے ملی اور یا پھر وقت پر کسی طے شدہ گاڑی کے نہ ملنے کی وجہ سے اِتّفاقاً یہی گاڑی اُس کے ہتھّے چڑھ گئی۔ "

"کیا تُم یہ کہنا چاہتے ہو۔ " پرویز نے کہا۔ "کہ مُجرم اور کار کے مالک کا آپس میں کوئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

"اے۔ اِدھر، اخبار اِدھر لاؤ۔ " پرویز نے اپنی بات پوری نہ کی تھی کہ جاوید ایک طرف دیکھ کر بولا۔ ہوٹل کا صفائی کرنے والا لڑکا ایک خالی میز پر کپڑا مار رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں وہ اخبار اُٹھائے ہوئے تھا۔ جاوید کا اشارہ سمجھ کر وہ اخبار اُس کے ہاتھ میں دے کر واپس چلا گیا۔

"یہ دیکھو۔ " اخبار میز پر پھیلاتے ہوئے جاوید بولا۔ "یہاں بھی وہی بات۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کُچھ لوگ سارے شہر میں ہوٹلوں کے اخبارات پر سُرخ چوکھٹے بنایا کرتے ہیں۔ "

”یہ کیا بات ہوئی۔ “ پرویز جھنجھلا کر بولا۔ ”ایک بات کرتے کرتے دوسری میں اُلجھ گئے۔ “

”تُم اِس کو معمولی بات سمجھ رہے ہو؟“ جاوید بولا۔ ”ذرا غور کرو۔ کُچھ لوگ ایک ایک ہوٹل میں جا کر بھڑکانے والی خبروں اور مضمونوں پر سُرخ چوکھٹے بناتے ہیں۔ کُچھ لوگ رکشوں میں بیٹھ کر اُن کی کارگزاریوں کا معائنہ کرتے ہیں۔ ہوٹل کا ایک اخبار صُبح سے رات تک سینکڑوں آدمیوں کی نظروں سے گزرتا ہے اور سُرخ حاشیوں کی وجہ سے اُن میں سے کوئی بھی اِن خبروں کو پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ خبریں کسی ایک ہی سیاسی جماعت کے خلاف نہیں ہوتیں۔ ایسی ہر خبر پر سُرخ چوکھٹے بنانا ہرگز کسی سیاسی جماعت کے کارکنوں کا کام نہیں ہو سکتا۔“ جاوید کے لہجے میں جوش پیدا ہو چکا تھا۔

”پھر کسے غرض پڑی ہے جو یہ سب کرتا پھرے۔ کِسی کو اِس سے کیا فائدہ

ہے؟" پرویز نے کہا۔

"یہی بات ہمیں سوچنی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِس طرح اگر بھڑکانے اور پاکستانیوں کو پاکستانیوں کے خون کا پیاسا بنانے کی کوششوں سے کسی نہ کسی کو فائدہ ضرور پہنچ رہا ہے۔"

یہ کہ کر جاوید اُٹھتے ہوئے بولا۔ "یہ بات بہت اہم ہے۔ ڈیڈی آ گئے تو اُنہیں بتائیں گے۔ چلو دیکھیں کار کا کیا ہوا۔"

بیگم الیاس

سڑک پر پہنچ کر اُنھوں نے دیکھا کہ کار اپنی جگہ موجود ہے۔ اِرد گرد غور سے دیکھنے پر اُنھیں جلد پتا چل گیا کہ سادہ کپڑوں میں پولیس کے سپاہی ہر طرف چوکس ہیں۔

"اب ہماری یہاں کوئی ضرورت نہیں۔ مہربانی کر کے سیدھے گھر تشریف لے چلیے۔" پرویز نے کہا۔

"اوکے۔" جاوید نے ہنستے ہوئے کہا اور اسکوٹر کو گھر کی طرف دوڑانا شروع

کر دیا۔

پانچ ہی منٹ بعد وہ اپنے گھر میں تھے۔ اُن کی امّی کو بِلّی اور نیولا دونوں ہی بہت پسند آئے۔ اُنھوں نے اُن کو ڈرائنگ روم میں شیشے کے شوکیس کے اوپر آمنے سامنے رکھ دیا اور اُن کے لیے گلے کے پٹے تیّار کرنے کے لیے مشین پر جا بیٹھیں۔

گھر کی ملازمہ نصیبن بُوا نے لڑکوں کے لیے کھانا نکال دیا۔ دونوں کھانے پر ٹوٹ پڑے اور جب تک پیٹ نہ بھر لیا کسی نے ایک بات بھی نہ کی۔ کھا پی کے دونوں تعریفیں کرتے ہوئے امّی کے کمرے میں جا پہنچے۔ وہ سُرخ اور سُنہرے ململ کے ٹکڑوں کے پٹّے سی کر اُن کے کناروں پر گوٹا لگا چُکی تھیں اور اب اُن میں موتی ٹانکنے جا رہی تھیں۔ دونوں نے جا کر اُن کا ایک ایک بازو پکڑ لیا اور کہنے لگے۔ "واہ وا! کیا کریلے پکائے ہیں۔ سبحان اللہ۔ ماشاء اللہ۔ لائیے جلدی کیجیے۔ آپ کے ہاتھ چوم لیں۔" کُچھ دیر تو امّی

اِن حرکتوں سے مزے لیتی رہیں مگر جب وہ بجتے ہی چلے گئے تو زور کی ڈانٹ پلا کے اُنھوں نے دونوں کی پیٹھ پر ایک ایک ہاتھ جڑ دیا۔ دونوں ہنستے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

پانچ بجے کے قریب جب وہ ہلکے ناشتے سے فارغ ہو کر چائے کی چُسکیاں لے رہے تھے تو نہ صرف تر و تازہ دکھائی دے رہے تھے بلکہ اُن کی نگاہوں سے سنجیدگی بھی جھلک رہی تھی۔

"ہاں۔ تُم کار کے مالک اور مجرم کے بارے میں کُچھ کہہ رہے تھے ہوٹل میں؟" جاوید نے کہا۔

"تم نے وہاں جو کُچھ کہا تھا اُس سے میں یہ سمجھا تھا تمہارے خیال میں اِن دونوں کا آپس میں کوئی تعلّق ہے۔" پرویز بولا۔

"ہاں مُجھے شُبہ ہے۔" جاوید بولا۔ "کار کی چوری کی خبر کے بعد الیاس منزل

کی واردات پہلے سے زیادہ پیچیدہ دکھائی دیتی ہے اور مجرم بھی پاگل ہونے کے بجائے خطرناک بدمعاش معلُوم ہوتا ہے۔ اب کئی باتوں کے بارے میں میری رائے صاف ہو چکی ہے۔ اور یہ کہ بھُس بھرے جانوروں کا ڈاکہ شوق پورا کرنے کے لیے نہیں ڈالا گیا۔ اِس کا سبب کوئی خاص بات ہے۔ دیکھو کار کے مالک نے کار کو ٹھیک دس بجے چھوڑا۔

مجرم اِس کار میں پونے گیارہ کے قریب نیلام میں پہنچا۔ کار کے مالک نے ساڑھے گیارہ بجے کے بعد چوری کی رپورٹ کی۔ یعنی اُس وقت جب مجرم اپنا سارا کام ختم کر کے اُسے لالو کھیت میں چھوڑ گیا تھا۔ یہ بات صاف ظاہر کرتی ہے کہ واردات کے لیے اِس کار کا انتخاب کرنے سے پہلے ہوشیار مُجرم نے اِن سب باتوں کے بارے میں اطمینان کر لیا تھا۔ میں اِن ساری باتوں کو اتّفاق نہیں کہہ سکتا۔ کار کا مالک اِس سازش میں شریک ہو یا نہ ہو، اُس کی کار اتّفاقیہ طور پر اِس واردات کے لیے چوری

نہیں کی گئی۔"

"پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" پرویز نے پوچھا۔

"ایک تو ہمیں الیاس کی بیوہ یا اُس کے مینجر سے مل کر جانوروں کے بارے میں معلُوم کرنا چاہیے۔ پھر ہم الیاس کے دوستوں اور دُشمنوں کا پتا کریں۔" جاوید نے کہا اور اِس کے ساتھ ہی الیاس منزل کی برساتی اور سڑک کا معائینہ بھی کریں۔"

"کیوں؟ وہاں اب کیا رکھا ہے؟" پرویز نے پوچھا۔

"برساتی کے کھمبے ہیں مُجرم کی دو گولیاں لگی تھیں۔" جاوید نے کہا۔ اور مُجرم نے اپنا ایک پیر کار سے نکال کر سڑک پر رکھا تھا۔ یہ بات ہم چچا خان کو بتانا بھُول گئے تھے۔ ہو سکتا ہے وہاں اُس کے جُوتے کا نشان مِل جائے۔"

”ارے ہاں۔“ پرویز چیخ پڑا۔ ”اور مُمکن ہے کار کے دروازے اور اسٹیئرنگ وغیرہ پر بھی مجرموں کی اُنگلیوں کے نشانات مِل جائیں۔“

”مُمکن ہے۔“ جاوید نے کہا۔ ”کار کے مالِک سے مُلاقات کرنا ضروری ہے۔۔۔۔“

”جاوید، تمہارا فون ہے۔“ ڈرائنگ روم سے امّی کی آواز آئی۔

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو گھورا اور پھر لپکتے ہوئے ڈرائنگ روم میں جا پہنچے۔ بِلّی اور نیولے کے گلے میں مخملی پٹے ڈال کر امّی اب اُن کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پرویز جانوروں کو دیکھنے لگا اور جاوید نے بڑھ کر ٹیلیفون اُٹھا لیا۔

”ہیلو۔ کون صاحب ہیں۔ جی؟ محمد اسلم صاحب؟ اوہ مُعاف کیجیے۔ پہچان گیا۔ فرمائیے۔۔۔۔ جی ہاں بڑے شوق سے چھ بجے۔ اچھّی بات ہے۔

بے فکر رہیے۔ ہم پُہنچ جائیں گے۔"

"لو بھئی، ایک مُشکل خود بخود آسان ہو گئی۔" ٹیلی فون رکھتے ہوئے جاوید پرویز سے بولا۔ "بیگم الیاس ہم سے ملنا چاہتی ہیں۔ چھ بجے اپنے مینجر کے دفتر آرہی ہیں۔"

"بہت اچھّے اور یہ دفتر کہاں ہے؟" پرویز نے کہا۔

"نمبر ۲٦ زیبا مینشن۔ میکلوڈ روڈ۔" جاوید نے کہا۔

"ابھی سوا پانچ بجے ہیں۔ پونے چھ چلیں گے۔" پرویز نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "آؤ آدھ گھنٹہ ہم ریڈیو سے تفریح لیں۔"

"پورے آدھ گھنٹے تک وہ ہیم سیٹ پر کبھی باہر کے اور کبھی کراچی کے مختلف ریڈیو سگنل اور پیغامات کیچ کرتے رہے۔ اِس کے بعد اسکوٹر پر چھ بجے محمد اسلم کے دفتر پہنچ گئے۔

”یہ ہیں محترمہ الماس صاحبہ مرحُوم الیاس کی بیوہ۔ ایک دوہرے بدن کی اُدھیڑ عُمر خاتون کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے مینجر نے کہا۔ اور پھر اُن دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خاتون سے بولا۔ ”یہ ہیں ہمارے مہمان۔“ دونوں لڑکوں نے بیگم الیاس کو سلام کیا اور مینجر کے سامنے کی کُرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بیگم الیاس کے چہرے سے فکر اور بے چینی جھانک رہی تھی۔ اُنہوں نے مُسکرا کر بچّوں کے سلام کا جواب دیا۔ اتنے میں چپڑاسی نے اورنج کی ایک ایک بوتل سب کے سامنے لا کر رکھ دی۔ کُچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر اورنج کی ایک چُسکی لے کر بیگم نے کہا۔ ”میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ سُنا ہے آپ ہی لوگوں کی اِطلّاع پر واردات والی کار پکڑی گئی۔“

جاوید اور پرویز اِس بات پر حیران ضرور ہوئے کہ یہ بات بیگم صاحبہ کو کس نے بتائی مگر یہ حیرت چھپاتے ہوئے وہ جواب میں مُسکرا دیے۔

"میں نے سُنا ہے کہ آپ لوگوں کو جاسوسی کا بھی شوق ہے۔ آپ کے والد صاحب بھی اِس سِلسلے میں آپ کا دِل بڑھاتے رہتے ہیں۔" بیگم نے کہا۔

"جی ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔" جاوید نے جواب دیا۔

"دیکھیے میں اِن جانوروں کی چوری سے بہت پریشان ہوں۔ اگر آپ اُنہیں واپس دِلا سکے تو میں بہت شُکر گزار ہوں گی۔ آپ کے والد بھی اِس معاملے میں آپ کی مدد کریں گے۔"

"ہم کوشش کریں گے۔ آپ کی چیزیں واپس مل گئیں تو ہمیں خُوشی ہو گی۔" جاوید نے جواب دیا۔ اور پھر فوراً ہی سوال کیا۔ "کیا آپ بتائیں گی کہ ان بھُس بھرے جانوروں میں ایسی کیا خاص بات ہے جو اُن پر ڈاکا ڈالا گیا اور آپ اُن کی واپسی کے لیے اتنی بے چین کیوں ہیں؟"

یہ سُن کر بیگم الیاس کُچھ سٹپٹا سی گئیں، پھر اورنج کا ایک گھونٹ حلق سے

اُتار کر بولیں۔

"میں ڈاکا ڈالنے والے کے متعلّق تو کُچھ نہیں کہہ سکتی البتّہ مُجھے اُن کی فِکر یُوں ہے کہ کم از کم دو ہزار کا مال ہو گا اور میرے لیے اب ایک پیسہ بھی ایک لاکھ کے برابر ہے۔"

"مگر سُنا ہے۔ مُجرم ڈاکا مارنے سے پہلے دو ہزار روپے دینے کو تیّار تھا۔ خیر چھوڑیے اِس بات کو۔" جاوید نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ ہمیں الیاس صاحب کے دوستوں اور دُشمنوں کے بارے میں کُچھ بتائیں گی؟"

"میں نہیں جانتی کہ اُن کے دوست یا دشمن کون تھے۔ اُنھوں نے مُجھے کبھی کسی سے ملایا ہی نہیں۔ مُجھے ہدایت تھی کہ کوئی ملنے والا آئے تو میں ڈرائنگ روم میں نہ آؤں۔ باہر کی کوئی بات وہ مُجھ سے کبھی نہ کرتے تھے۔ اس پر میرا اُن کا کبھی جھگڑا بھی ہو جایا کرتا تھا۔"

”کیا آپ سمجھتی ہیں کہ کُچھ لوگوں سے اُن کے خُفیہ تعلّقات تھے یا یہ کہ وہ کوئی خاص راز آپ سے چھپایا کرتے تھے؟“

چند لمحوں تک بیگم الیاس سے اِس کا جواب نہ بن پڑا۔ وہ سخت کشمکش میں معلوم ہوتی تھیں۔ آخر اُنہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”مم میں۔ کُچھ نہیں کہہ سکتی۔ مُجھے کُچھ نہیں معلوم۔ اِسی بات پر میرا اُن سے جھگڑا ہو جاتا تھا۔“

”کیا آپ بتائیں گی کہ آخری بار آپ کا اُن سے کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟“

”بس۔ بس یہی۔ باہر کی باتیں چھپانے پر۔ ایک دِن کسی انگریز سے اُن کی تکرار ہو رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ بند تھا۔ میں دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ کُچھ دیر بعد انگریز گیا تو اُس کے جاتے ہی دو دیسی آدمی آ گئے۔ پہلے وہ کُچھ دیر آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے، پھر اُن سے بھی اِن کی تکرار

ہونے لگی۔ جب وہ بھی چلے گئے تو مُجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُنہوں نے دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا وہ غصّے سے سُرخ ہو رہے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ کس بات پر جھگڑا ہو رہا تھا؟ تو مُجھ سے بھی لڑنے لگے؟ میں اپنے مائیکے چلی گئی اور اُس کے چوتھے ہی دِن اُنہوں نے خود کُشی کرلی۔ یہ کہہ کر اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کُچھ دیر مُنہ پر رومال رکھے سِسکیاں لیتی رہیں۔ پھر جب اُنہیں کُچھ سکون میں محسوس کیا تو جاوید نے پوچھا۔

”کیا آپ کو کُچھ ایسے الفاظ یاد ہیں جو اُس دِن تکرار کے موقع پر کسی نے کہے تھے؟“

”میں کسی کا ایک لفظ بھی نہیں سُن سکی۔ صرف آواز کے اُتار چڑھاؤ سے تکرار کا اندازہ لگایا تھا۔ دروازے ایسے ہیں کہ بند ہوں تو زور سے بولنے پر بھی کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا۔“

جاوید اور پرویز کو اندازہ ہو گیا کہ وہ جان بوجھ کر اُن سے کُچھ چھپا رہی ہیں۔ اُنھوں نے بیگم کو تسلّی دی، کل اُسی وقت پھر آنے کا وعدہ کیا اور پھر الیاس منزل کی طرف چل دیے۔

آسمانی سرکس

سورج ڈوب چکا تھا۔ دونوں بھائی جب الیاس منزل کے پھاٹک پر پہنچے تو ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پرویز نے اسکوٹر سے اُتر کر پھاٹک کے ایک پٹ کو آہستہ سے دھکّا دیا تو وہ پیچھے کو کھسکنے لگا۔ دونوں بھائی بے فکری سے اندر چلے گئے۔ ساری کوٹھی خالی پڑی تھی۔ بیگم الیاس اپنے شوہر کی موت کے بعد اب اپنے مائیکے ہی میں رہتی تھیں۔

اسکوٹر کو ایک جانب کھڑا کر کے اور اُس کی بتّی بُجھا کر دونوں نے اپنی اپنی

ٹارچیں نکالیں۔ پھر سڑک کے اس ٹکڑے کی حد مقرّر کی جہاں اُن کے خیال میں مجرم نے اپنا پیر رکھا تھا اور پھر اُس ٹکڑے کے ایک ایک انچ پر نگاہیں دوڑانے لگے۔ اُنھیں سخت مایوسی ہوئی۔ نیلام میں آنے والے لوگوں اور اُن کی سواریوں نے جوتوں کا کوئی نشان نہ چھوڑا تھا۔ رہی سہی کسر ہواؤں اور سڑک کنارے کے درختوں کے سوکھے پتّوں نے پوری کر دی تھی۔

مایوس ہو کر وہ اپنی ٹارچیں بُجھانے ہی والے تھے کہ اچانک اُن کی نگاہ تازہ نشانوں پر پڑی۔ یہ نشانات برساتی کی طرف گئے تھے۔ یہ کرمچ کے جوتوں جیسے نشان تھے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی شخص تھوڑی دیر پہلے عمارت کے اندر گیا ہے اور ابھی واپس نہیں ہوا۔ دونوں بھائی ابھی یہ نہ سوچ پائے تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں کہ اِسی اثنا میں پرویز کو عمارت کے اندر ایک پُراسرار روشنی حرکت کرتی محسوس ہوئی۔ کھڑکیوں پر ظاہر

ہونے والی چمک سے پتا چل رہا تھا کہ کوئی آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ چمک اُنہیں برساتی سے ملے ہوئے بڑے کمرے یا ڈرائنگ روم میں جھلکتی دکھائی دی۔ دونوں بھائی دائیں بائیں کھمبوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔ کُچھ دیر بعد ایک سایہ دروازے سے باہر نکلا۔ دروازہ بند ہونے اور اُس کے تالے میں چابی گھمانے کی آواز ہوئی۔ پھر ایک لمحہ ٹھٹھک کر سایہ سیڑھیوں سے نیچے اُترا اور پھاٹک کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی وہ دو ہی قدم آگے گیا ہو گا کہ دونوں جانب سے جاوید اور پرویز نے اُسے دبوچ لیا۔ وہ ایک دس گیارہ سال کا لڑکا تھا اور سخت خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

”گھبراؤ نہیں، ہم تمہارے دوست ہیں دُشمن نہیں۔“ جاوید نے لڑکے سے کہا۔ ”ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تم کون ہو اور اِس وقت یہاں کیا کر رہے تھے؟“

"میں کوئی چور نہیں۔ یہ میرے ماموں کی کوٹھی ہے۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تمہارا۔"

"مجید شیخ اور میرے ماموں کا نام الیاس شیخ۔"

"تُم نے تالا کیسے کھولا اور اِس وقت یہاں آنے کا کیا مطلب تھا ہے؟"

"میرے پاس چابی ہے۔ ماموں نے دی تھی۔" لڑکے نے چابی دِکھاتے ہوئے کہا۔ "مُمانی آج کل میں یہ کوٹھی بیچ دیں گی۔ میرا جی چاہا کہ بکنے سے پہلے ایک بار اور دیکھ لوں۔"

"کیا تُم مُمانی کے ساتھ دِن میں نہیں آسکتے تھے؟"

"نہیں۔ مُمانی ہم سے ناراض ہیں۔"

"تُم بُہت اچھّے لڑکے ہو۔ آج سے میں تمہیں اپنا دوست بنانا ہوں۔ میرا

نام جاوید ہے۔ ‘‘جاوید نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

’’اور میں بھی تمہیں دوست بناتا ہوں۔ میرا نام پرویز ہے۔ ہم دونوں بھائی ہیں۔ ‘‘پرویز نے بھی ہاتھ مِلایا۔

’’تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں مِٹھائی کھلائیں گے۔ ہم ریڈیو پر دوسروں کی باتیں سنوائیں گے اور جہاں کہو گے اسکوٹر پر چھوڑ آئیں گے۔ بولو منظور ہے؟ ‘‘جاوید نے کہا۔

’’کیا تمہارے پاس اسکوٹر ہے؟ ‘‘لڑکے نے راضی ہوتے ہوئے پُوچھا۔

’’ہاں۔ لان میں کھڑا ہے۔ ‘‘

’’اچھّا چلو۔ ‘‘لڑکے نے کہا۔ اور تینوں اسکوٹر کی طرف چل دیے۔

’’کہا تمہارے ماموں تمہیں بہت چاہتے تھے؟ ‘‘جاوید نے پوچھا۔ ’’آخری بار تُم اُن سے کب ملے تھے۔ ‘‘

"وہ مُجھے بہت چاہتے تھے اور مرنے سے تین دِن پہلے مُجھے روز بُلاتے تھے۔ جس رات وہ مرے اُس شام کو میں اُن کے پاس تھا۔ اُنہیں اپنی موت کا کئی دِن پہلے سے پتا ہو گیا تھا۔" لڑکے نے کہا۔

"یہ تُم کیسے کہتے ہو؟" جاوید نے پوچھا۔ اب وہ اسکوٹر کے قریب پہنچ گئے تھے۔

"تین دِن پہلے اُنہوں نے مُجھ سے کہا تھا بیٹا مجید، مُجھے اپنی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ اب تُم روز میرے پاس آیا کرو۔ اور آخری دِن۔ ۔ ۔" لڑکا کہتے کہتے رُک گیا اور کُچھ سوچنے لگا۔

"ہاں، ہاں، رُک کیوں گئے؟ کیا ہوا آخری دِن؟" جاوید پیار سے بولا۔

"آخری دِن، جب میں اُن کے پاس سے جانے لگا تو اُنہوں نے کہا، مجید میری مُدّت آج پوری ہو رہی ہے۔ اب شاید تُم دوبارہ تُجھے نہ دیکھ سکو۔

میں مر جاؤں تو آپا سے کہنا مُجھے معاف کر دیں۔ اور۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں۔ اور کیا کہا؟" جاوید نے پوچھا۔

"بس کُچھ نہیں۔ پھر میں چلا گیا۔" مجید نے اس طرح کہا جیسے وہ کوئی بات چھُپانا چاہتا ہے۔

جاوید نے بھی اُس وقت زیادہ اصرار کرنا مُناسب نہ سمجھا۔ تینوں اسکوٹر پر بیٹھ کر گھر آ گئے۔ کھانے میں اُس وقت کوفتے آلو کا بھرُتا اور دوپہر کے دو قیمہ بھرے کریلے تھے۔ جاوید نے اپنے حصّے کا کریلا مجید کو دے دیا۔ سب چیزیں لذیذ تھیں۔ مجید نے اِس طرح کھایا جیسے کئی دِنوں کا بھوکا ہو۔ بعد میں جب پھل سامنے آئے تو وہ ایک کیلے اور آدھے سیب سے زیادہ نہ کھا سکا۔ اب اُس کا دِل دونوں بھائیوں سے صاف ہو چکا تھا اور وہ اُنہیں ہر بات بتانے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی جاوید نے بہتر سمجھا کہ اُسے تھوڑا سا اور وقت دیا جائے۔ وہ اُسے مطالعے کے کمرے میں لے گئے اور ہیم

ریڈیو سیٹ پر وائرلیس کے ذریعے لوگوں کی گفتگو سُننے لگے۔ مجید کے لیے یہ بالکل نئی چیز تھی۔ کراچی الیکٹرک سپلائی کے ایک سب اسٹیشن اور اُس کے گشتی سٹاف کے درمیان ہونے والی بات چیت سُن کر وہ بہت خوش ہوا۔ اس کے بعد کراچی ہی کی کوئی اور دوسری گفتگو کیچ کرنے کے لیے جاوید ڈائل کی سوئی کو حرکت دینے لگا۔ اسی لمحے اچانک ایک جگہ کُچھ عجیب سی آوازیں سُنائی دیں جو سُوئی کے کِھسکنے سے بند ہو گئیں۔ جاوید نے چونک کو پھر اُسی جگہ سوئی لگا دی اور پرویز کو دیکھنے لگا۔ بِلّیوں کے لڑنے جیسی آوازیں صاف آ رہی تھیں۔ پرویز نے لپک کر ٹیپ ریکارڈ اُٹھایا اور جاوید کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

چند ثانیوں بعد عجیب و غریب آوازیں آنا بند ہو گئیں اور اُن کے ختم ہوتے ہی ایک خوفناک للکار بُلند ہوئی۔ "آسمانی سرکس۔" یہ آواز کئی بار گونجی اور ہر بار دھیمی ہوتے ہوئے غائب ہو گئی۔ اِس کے بعد تین بار

شڑاپ شڑاپ کی آوازیں آئیں جیسے کوئی ہنٹر پھٹکار رہا ہو۔ پھر کسی نے للکارتے ہوئے کہا۔

"میں رِنگ ماسٹر ہوں۔ آسمانی سرکس کا رِنگ ماسٹر، جنگل کے بادشاہ، جنگل کے بادشاہ، چلو رِنگ میں آؤ۔" پھر دوبارہ چابُک پھٹکارنے کی آواز آئی اور شیر خاموش ہو گیا۔

"شکار کی سُناؤ۔" رِنگ ماسٹر بولا۔

شیر کی ہلکی غُرّاہٹ کی آواز آئی پھر کسی نے کہا۔ "گیارہ ہاتھ لگے۔ اٹھارہ بھاگ گئے۔ نہ خُون ملا نہ گوشت۔"

"ہوں۔ رِنگ ماسٹر دھاڑا۔ "بھاگے ہوئے پکڑو، جھاڑیوں کی تلاشی اور خُون اور گوشت حاصل کرو۔ سُنا؟"

شیر کی ہلکی غُرّاہٹ کی آواز آئی۔ "جاؤ بھاگ جاؤ۔" رِنگ ماسٹر نے چابک

پھٹکارا۔ شیر کی گرج آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ کُچھ وقفے کے بعد رِنگ ماسٹر نے پھر تین بار چابک پھٹکارا اور چلّایا۔ “گوریلے رِنگ میں آ، گوریلے رِنگ میں آ۔ سُنتا ہے کہ نہیں۔” اِس کے بعد دوبارہ چابک پھٹکارنے کی آواز آئی، اسی کے ساتھ ایک گوریلے کی چیخ قریب آتی محسوس ہوئی۔ چابک کی ایک اور پھٹکار بُلند ہوئی اور گوریلے کی چیخ چنگھاڑ ختم ہو گئی۔

“ہُوں۔” رِنگ ماسٹر دھاڑا۔ “کالے دیو، تُو کیا کہتا ہے؟”

گوریلے کی غُرّاہٹ کی آواز اُبھری اور ختم ہو گئی۔ اس کے بعد کسی نے جواب دیا۔ “الاؤ تیّار ہو رہا ہے۔ کاغذ کی آگ خُوب کام دے رہی ہے۔ دھونکنیاں ٹھیک کام کر رہی ہیں۔ ایک باغ کی مُقدّس پتّیاں اور ڈال دی ہیں۔ آگ پھیلنے لگی ہے۔ مگر مالی بولی نہیں بولتا۔”

“ہوں۔” رِنگ ماسٹر چیخا۔ “مالی کو بھی الاؤ میں ڈال دو۔ کاغذ اور دھونکنیوں سے اور کام لو۔ سُندر بن کی آگ کے انگارے بھی استعمال کرو۔ سُن

رہے ہو؟“

گوریلا ہلکے سے غُرّایا اور رِنگ ماسٹر چابک پھٹکارتے ہوئے چلّایا۔ ”جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔“ گوریلے کی چیخ چنگھاڑ بُلند ہوئی اور پھر تیزی کے ساتھ دور اور دھیمی ہوتی ہوئی غائب ہو گئی۔ اِسی کے ساتھ ہی مجمع کی تالیوں اور سیٹیوں کی آواز اُبھری اور پھر سنّاٹا چھا گیا۔

کُچھ دیر انتظار کرنے کے باوجود جب اور کوئی آواز نہ آئی تو جاوید نے ٹیپ ریکارڈ بند کر کے ہیم کا بھی سوئچ بند کر دیا اور دونوں بھائی ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔

”کیا ختم ہو گیا یہ تماشا؟ بڑا مزے دار تھا آسمانی سرکس۔“ مجید نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔“

”ہاں۔ اب پھر کسی دِن ہو گا۔“ جاوید نے کہا۔ ”تمھیں پسند آیا؟“

"بہت پسند آیا۔ اب پھر کب ہوگا یہ پروگرام؟" مجید نے بے چینی کے ساتھ پُوچھا۔

"ہم تمھیں بتا دیں گے۔" جاوید نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجید نے اُنھیں بتا دیا کہ ماموں نے اُس سے کہا تھا۔ "تمھارے لیے ایک بہت بڑی دولت میں نے کوٹھی میں چھُپا دی ہے۔ مر جاؤں تو ڈھونڈھ نکالنا۔"

اِس کے علاوہ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ ایک ایسے شخص کو جانتا ہے جو اکثر اُس کے ماموں کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ یہ شخص آج کل اکثر دِن کو برنس روڈ کے ہوٹلوں میں دِکھائی دیتا ہے۔ یہ لڑکا برنس روڈ ہی کے ایک فلیٹ میں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتا تھا۔

اگلے دِن ملاقات کا پروگرام بنا کر جاوید اُسے اسکوٹر پر اُس کے گھر چھوڑ

آیا۔

ڈرامے کا راز

دوسرے دِن صُبح سات بجے جاوید اور پرویز ناشتے کے لیے کھانے کے کمرے میں آئے تو میز پر اُردُو اور انگریزی اخبار رکھے ہوئے تھے۔ ایسا تبھی ہوا کرتا جب اُن کے ڈیڈی گھر پر ہُوا کرتے۔ جاوید نے بڑھ کر اُردُو اخبار اُٹھا لیا۔ لیکن ابھی اُس نے پہلے صفحے پر نظر ڈالی ہی تھی کہ اِکبارگی چونک پڑا۔ جلدی جلدی اُلٹ پلٹ کر دوسرے صفحات پر نگاہ دوڑائی۔

اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے پہلے اور آخری صفحے کی دو

خبروں پر سُرخ بال پن سے ضرب کے نشانات بنے پائے۔ پہلی خبر ڈھاکے میں ووٹروں کے فارموں کے سِلسلے میں ہونے والی ہڑتال اور فسادات کے بارے میں تھی۔ اور دوسری خبر کراچی کی ایک مسجد میں پُر اسرار طور پر ایک سیپارے کے ورق کاٹے جانے کے متعلّق تھی۔

تو گویا گھروں پر دیے جانے والے اخبارات میں بھی نشان لگائے جانے لگے۔" جاوید بُڑبُڑایا اور پھر اُٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلتے ہوئے چلّا کر کہنے لگا۔ "امّی یہ اخبار میز پر کس نے رکھتے ہیں؟"

"میں تھے رکھے ہیں۔ تمہارے ڈیڈی پڑھ رہے تھے۔ کیوں؟"

"کیا ڈیڈی آ گئے؟ کہاں ہیں؟"

"رات دیر سے آئے تھے۔ یہیں کہیں ہوں گے۔" اتنے ہی میں کھانے کے کمرے سے پرویز کے چیخنے کی آواز آئی۔ "ڈیڈی آ گئے۔"

جاوید تیزی سے پلٹ کر کمرے میں پہنچا۔ ڈیڈی کُرتا پاجامہ پہنے ہوئے تھے اور کُرتے کی بیلٹ پر اُن کا کئی رنگوں والا بال پن لگا ہوا تھا۔ بال پن پر نگاہ جماتے ہوئے جاوید نے بے صبری سے پوچھا۔

"ڈیڈی، یہ اُردُو اخبار کی خبروں پر نشان آپ نے لگائے ہیں؟"

"ہاں، کیوں؟" اُنھوں نے کہا اور اطمینان سے کُرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

جاوید بھی بیٹھ گیا اور اُس نے ہوٹلوں کے اخبارات میں خاص قسم کی خبروں پر بنائے جانے والے حاشیوں اور ایک شخص کے اِن نشانات کو دیکھتے پھرنے کے متعلّق ساری بات اُنھیں تفصیل سے بتا دی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے البتّہ آن کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آ گئی۔ اتنے میں ناشتا آ گیا۔ اس دوران میں جاوید نے الیاس منزل کی واردات کا ذکر چھیڑ دیا۔ یہ سِلسِلہ ناشتے کے بعد بھی جاری رہا۔ قریشی صاحب ایک لفظ بھی نہ بولے۔ آسمانی سرکس کے ذکر پر اُن کی آنکھوں کی

نہ صرف چمک بڑھ گئی بلکہ پھر سے پر سُرخی بھی دوڑنے لگی۔ پھر جاوید نے الیاس کے بھانجے کا ذکر کیا تو وہ میز سے اُٹھتے ہوئے بولے۔ "چلو مطالعے کے کمرے میں چلیں۔"

مطالعے کے کمرے میں پہنچتے ہی قریشی صاحب نے اپنے ہاتھ سے ٹیپ ریکارڈ کھولا اور آسمانی سرکس کی آوازیں سُننے لگے۔ جاوید اور پرویز بھی ایک ایک بات پر دھیان دے رہے تھے، ٹیپ ختم ہونے پر قریشی صاحب نے مشین کو بند کر کے ایک طرف کھسکا دیا۔ اُن کے چہرہ پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ کچھ دیر وہ خاموشی کے ساتھ سوچتے رہے پھر بولے۔ الیاس منزل کا کیس نہ زیادہ اہم ہے نہ پیچیدہ۔ عام آدمی کی نظر سے دیکھا جائے تو تم نے اس وقت تک مجرم کا کیا پھیلانے میں کوئی خاص کارگزاری نہیں دکھائی۔" یہ سُن کر جاوید اور پرویز نے نگاہیں نیچی کرلیں۔ قریشی صاحب کہنے لگے۔ "لیکن میری رائے میں

تم اس وقت تک تین انتہائی پُر اسرار اور اہم معاملات کے بارے میں آدھا کام ختم کر چُکے ہو۔ “

یہ سُن کر جاوید اور پرویز اُن کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔ ”سُراغ رسانی کا پہلا بنیادی آدھا کام یہ ہوتا ہے کہ کسی واردات یا معاملے کی اصل نوعیت اور صحیح غرض معلوم کی جائے۔ یعنی اُس بارے میں صحیح رائے قائم کر لی جائے کہ معاملہ اتّفاقیہ قسم کا ہے یا اس کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ “

سُراغ رسانی کا دوسرا آدھا کام وہ ہوتا ہے جس میں صحیح مُجرم کا کھوج لگا کر اُسے گرفتار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کم از کم میرے لیے تم پہلا آدھا کام قریب مکمل کر چکے ہو۔

میرے سامنے تین معاملات ہیں۔ الیاس منزل کا معاملہ اُن میں سے ایک ہے۔ مُجھے خوشی ہے کہ اِس کیس میں تم صحیح لائنوں پر چل رہے ہو۔ بیگم

الیاس کی گفتگو سے تُم یہ معلوم کر چُکے ہو کہ الیاس ایک پُر اسرار شخص تھا۔ خُودکُشی سے پہلے اُس کا ایک انگریز اور دو دیسی آدمیوں سے جھگڑا ہوا تھا۔ اِس جھگڑے کا سبب پوچھنے پر بیوی سے بھی اِس کا جھگڑا ہو گیا اور وہ اُسے چھوڑ کر چلی گئی۔ پھر الیاس کے بھانجے سے تُم اِس بات کی تصدیق کر چکے ہو کہ اُسے اپنی موت کا پہلے سے یقین تھا اور اُس نے کوئی دولت اپنے مکان میں چھپا رکھی ہے۔ یہ بڑا اچھّا ہوا کہ تمہیں کم از کم ایک ایسے آدمی کا پتا چلا ہے جو الیاس کے ہاں آتا جاتا تھا۔ اُس سے اور کار کے مالک سے ملنے اور الیاس کے مکان کی تلاشی لینے کا تمہارا خیال مُجھے بہت پسند ہے۔ اس سے ضرور کُچھ نہ کُچھ نئی کار آمد باتیں معلوم ہوں گی۔ اب دوسرے معاملات کے بارے میں سُنو۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے کرسی پر پہلو بدلا اور ایک گہری سانس لے کو کہنے لگے۔

"محکمۂ داخلہ کی ہدایت پر مُجھے ان لوگوں کے بارے میں تفتیش کرنی ہے جو

ملک کی سیاسی جماعتوں کے جھگڑوں سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے عوام کے مذہبی جذبات بھڑکا رہے ہیں اور بدامنی کے لیے راہ ہموار کر رہے ہیں۔ دوسرا معاملہ یہ ہے کہ محکمۂ داخلہ کو معلوم ہوا ہے کہ دُشمن کا ایک نیا اور خطرناک جاسوس گروہ کئی ماہ سے ہمارے ملک میں کام کر رہا ہے اور اس گروہ کے کارندوں کا پتا چلانا بھی میرے ہی ذمّے ہے۔ مُجھے ہیڈ کوارٹر اِسی لیے بُلایا گیا تھا۔ اِن دونوں معاملات کے بارے میں تُم نے مُجھے ٹھوس بنیادیں مہیّا کر دی ہیں۔ میرا آدھا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے اور اب میں صحیح لائنوں پر کام کر سکتا ہوں۔" جاوید اور پرویز نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ابھی تک اُن کا مطلب نہیں سمجھ سکے تھے۔ قریشی صاحب نے اُنھیں سمجھایا۔

"تمھاری ہوٹلوں کے اخبارات والی بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بھڑکانے والی خبروں پر حاشیے بنانے اور اُن کی نگرانی کا کام کسی ایسے

گروہ کی جانب سے کیا جا رہا ہے۔ جس کا مقصد ملک میں بدامنی اور خانہ جنگی کی آگ بھڑکانا ہے۔ مسجد کے واقعے اور ڈھاکے کے فسادات کو بھی میں اسی خطرناک گروہ کی کارگزاری سمجھنے پر مجبور ہوں۔"

"تمہارا ٹیپ کیا ہوا آسمانی سرکس مُجھے یہی سمجھنے پر مجبور کر رہا ہے۔ بلکہ اب میں یہ دعویٰ بھی کر سکتا ہوں کہ محکمۂ خارجہ نے جس دُشمن جاسوس گروہ کی اِطّلاع دی ہے یا محکمۂ داخلہ جس گروہ سے پریشان ہے وہ یہی آسمانی سرکس ہے جو ہوشیاری کے ساتھ تین مختلف اور خلافِ قانون ہیم سیٹوں کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ رِنگ ماسٹر اِس خُفیہ گروہ کا لیڈر ہے اور شیر اور گوریلا اِس کے نائب ہیں۔ چابُک اور جانوروں کی آوازوں سے وہ بات سُننے یا ختم کرنے کے سگنل کا کام لیتے ہیں۔

یہ گروہ مُلک میں بدامنی کا الاؤ بھڑکانے پر مامور ہے اور کاغذ یعنی اخبارات

اور ڈھونکنیوں یعنی افواہوں کے ذریعے فضا خراب کرنا اِس کا کام ہے۔ اِسی نے ایک باغ (مسجد) کی مقدّس پتّیاں (سیپارے کے ورق) کاٹے ہیں اور اِس کا الزام عوام کے ایک خاص گروہ پر رکھ کر فساد کرانا چاہتا ہے۔ مگر مالی یعنی اِس مسجد کا امام اُن کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا۔"

"اگر میرے یہ خیالات صحیح ہیں۔" قریشی صاحب نے لڑکوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو رِنگ ماسٹر کی ہدایت کے مطابق سیپارے کے واقعے کے سِلسلے میں پروپیگنڈہ اور ہنگامے کی مُہم تیز کرنے کی کوشش کی جائے گی اور امام کو بھی اِس کی لپیٹ میں لے لیا جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ سُندر بن یعنی ڈھاکے کے واقعات کو بہانہ بنا کر شہر میں علاقائی تعصّب اور نفرت کی چنگاریاں بھی پھیلائی جائیں گی۔"

یہ کہہ کر قریشی صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور لڑکوں کو تاکید کرتے ہوئے بولے۔ "میں ہوٹلوں کے اخبارات اور مسجد کے واقعات کے سِلسلے میں

تفتیش شروع کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے عملے کو ہدایات دینی ہیں اور اِس کے بعد تمہارے چچا خان سے بھی ملنا ہے۔ تُم برنس روڈ میں مجید سے نپٹ کر دس بجے تک پیش امام کے یہاں پہنچ جانا۔ وہاں سے ہم کار کے مالک کے پاس چلیں گے۔"

سوا نو بجے کے قریب جاوید اور پرویز اسکوٹر پر برنس روڈ پہنچ گئے۔ مجید اپنے فلیٹ کے نیچے اُن کا اِنتظار کر رہا تھا۔ اُنہیں آتا دیکھ کر وہ لپک کر اُن کے قریب گیا اور سلام دُعا کے بعد بولا۔

"میری امّی تُم سے بہت خوش ہیں۔ میں نے اُن سے تمہارا ذکر کیا تھا۔ اُنھوں نے مُجھے دو روپے دیے ہیں۔ کہا ہے، یا گھر لے آنا یا ہوٹل میں خاطر کر دینا۔" جاوید اور پرویز اُس کی سادگی پر مُسکرانے لگے تو اُس نے کہا:

"مگر میں نے امّی کو یہ نہیں بتایا کہ ہماری ملاقات ماموں الیاس کے مکان میں ہوئی تھی۔ تُم بھی مت کہنا۔"

"بھئی اب تو تُم ہمارے دوست ہو گئے ہو۔ تُم سے کیا تکلّف۔" جاوید نے کہا۔ "ضرور چلیں گے تمہارے گھر۔ مگر آج نہیں پھر کبھی۔ اِس وقت تُم ہمیں بس اُس آدمی کو دِکھا دو۔"

"شابو بھائی کو؟ اُنہیں میں نے دیکھ لیا ہے۔ نُکّڑ والے ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔" مجید نے کہا۔

"شابُو بھائی؟ کون شابو بھائی؟" جاوید نے حیران ہوتے ہوئے پُوچھا۔ وہی جن کا رات میں نے ذکر کیا تھا۔ ویسے اُن کا نام شہاب الدّین ہے مگر لوگ شابُو بھائی کہتے ہیں۔ وہ بڑے خراب آدمی ہیں۔ امّی کہتی ہیں کہ مامُوں کو اُنھوں نے ہی بگاڑا ہے۔" مجید مُنہ بنا کر بولا۔

"بس تُم دُور سے دِکھا دو۔ ہم بعد میں تمہیں بتائیں گے کہ وہ کیسے ہیں۔" جاوید نے کہا۔

"مگر میں بغیر خاطر کے تمہیں نہ جانے دوں گا۔ " مجید بولا۔

"اچھّا چلو لسّی پِلا دو۔ " جاوید نے کہا۔ اِس پر تینوں لسّی کی دُکان کی طرف چل دیے۔ لسّی پی پلا کر جب یہ لوگ آگے چلے تو ایک ہوٹل کے سامنے رُک کر مجید نے ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ کالے مخمل کی ٹوپی اور کھچڑی داڑھی والے کُرتا پہنے گورے گورے سے۔ دیکھا؟ "

"وہ جو ایکٹنگ کرتے ہوئے باتیں کر رہے ہیں؟ " جاوید نے کہا

"ہاں۔ بس وہی شا بُو بھائی ہیں۔ میں چلوں تمہارے ساتھ؟ " مجید نے کہا۔

"نہیں۔ تُم جاؤ۔ ہم انشاء اللہ کل ملیں گے۔ " جاوید نے کہا۔

"اگر تُم نہ آئے تو شام کو میں خود آ جاؤں گا۔ " مجید نے جاتے ہوئے کہا۔

"اچھّی بات ہے۔" جاوید نے ہاتھ ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اسکوٹر کو ہوٹل کی دیوار کے قریب کھڑا کر کے دونوں بھائی شابُو کی برابر والی میز پر جا بیٹھے۔ شابُو کی میز پر پمفلٹوں کی کئی گڈّیاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بڑے زہریلے انداز میں اپنے گِرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو جوش دِلا رہا تھا۔ موضوع وہی سیپارہ والا واقعہ تھا۔ ایک سیاسی جماعت کے حامیوں کے علاوہ وہ مسجد کے امام کو بھی اِس واقعہ کا ذمّہ دار ٹھہرا رہا تھا۔ اُس کی باتیں سُن کر جاوید اور پرویز کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُن کے ڈیڈی کی بات حرف بہ حرف پوری ہو رہی تھی۔

"کیا میں ایک پمفلٹ دیکھ سکتا ہوں؟" جاوید نے شابُو سے کہا۔

"ہاں۔ شوق سے۔" شابُو نے کہا اور پمفلٹ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

یہ دو صفحات کا پمفلٹ تھا اور اِس کا عنوان تھا۔ "وقت آ گیا ہے۔" اُس

میں جو کُچھ کہا گیا تھا اُس کا خلاصہ یہ تھا کہ مُلک کی فلاں فلاں سیاسی جماعتوں کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ طاقت کے ذریعہ مُلک سے مذہب کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ یہ طاقت حاصل کرنے کے لیے وہ حکومت پر قبضہ جمانا چاہتی ہیں۔ لیکن اب چونکہ حکومت کا فیصلہ عام انتخابات کے ذریعے ہوتا ہے اور یہ جماعتیں عوام میں مقبول نہیں ہیں۔ اِس لیے اُنہوں نے عوام کو دہشت زدہ کر کے اُنہیں اپنے حق میں ووٹ دینے کے لیے مجبور کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ مقدّس کتابوں کی بے حُرمتی اور عبادت گاہوں پر حملے کرنا اِس پروگرام کا خاص حصّہ ہیں۔ فلاں مسجد میں سیپارے کی بے ادبی کا واقعہ اِسی سِلسلے کی ایک کڑی ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ سب جانتے ہوئے بھی اُس مسجد کا امام اِن سیاسی جماعتوں کو اِس واقعہ کا ذمّے دار نہیں ٹھہراتا۔ اِس سے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ شخص دُشمن دین جماعتوں سے ساز باز رکھتا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ مسجدوں کو ایسے

اسلام دُشمن لوگوں سے پاک کیا جائے اور مقدّس کتاب کی بے حرمتی کرنے والوں کے خلاف جہاد کیا جائے۔ پمفلٹ شائع کرنے والے ادارہ کا نام انجمن فنافی الاسلام دیا گیا تھا۔"

"بہت تیز کام کرتے ہیں۔ رات نو بجے رِنگ ماسٹر نے حُکم دیا اور صُبح ہی صُبح پمفلٹ آگیا۔" پرویز نے آہستہ سے کہا۔

"ہوں، اب یہ مجمع ٹلے تو اِن حضرت سے کُچھ بات چیت کی جائے"۔ جاوید بولا۔

"اچھّا اب جاؤ، دیر نہ کرو۔ یہ لے جاؤ۔" ہر شخص کو ایک ایک گڈّی پمفلٹ دیتے ہوئے شابُو نے کہا۔

شابُو کے گرد بیٹھے ہوئے پانچوں آدمی پمفلٹ لے کر چلے گئے۔

"جناب، ہم آپ سے کُچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔" جاوید نے شابُو سے کہا۔

"آئیے۔ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" شابُو نے جاوید اور پرویز کو دیکھتے ہوئے کیا۔

جاوید نے اپنا پتا بتاتے ہوئے کہا۔ "میرے والد ٹھیکے دار ہیں۔ میں پڑھتا ہوں۔ یہ میرا چھوٹا بھائی پرویز ہے۔ ہم نے نیلام میں سے الیاس مرحوم کے بنائے ہوئے دو جانور خریدے ہیں۔ سب کو بہت پسند آئے ہیں۔ میں الیاس صاحب کی زندگی پر ایک مضمون لکھنا چاہتا ہوں۔ پتا چلا ہے کہ آپ سے صحیح حالات معلوم ہوں گے۔"

جانوروں کی بات سُنتے ہی شابُو کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آ گئی۔ اس نے کُچھ سوچا اور پھر کہنے لگا۔

"الیاس کاریگر تو بہت اچھّا تھا مگر احسان فراموش آدمی تھا۔ کُچھ سال پہلے یہیں اپنی بہن کے ساتھ فلیٹ میں رہتا تھا اور کوڑی کوڑی کو محتاج تھا۔ میں نے اُسے آرڈر لا کر دیے، پیسے دیے۔ پھر اُس کا کلیم منظور کروایا۔

سوسائٹی کا پلاٹ خریدوایا۔ بنگلہ بنوایا۔ مگر میرے ساتھ اُس نے ہمیشہ دغا کی۔ کبھی پورا کمیشن نہ دِیا اور اخیر میں تو اُس نے مُجھے بہت ہی ذلیل کرایا۔"

یہ کہہ کر وہ رُکا تو جاوید نے پوچھا۔

"کیا بات ہوئی تھی؟"

"میاں ہوا یہ کہ چند ماہ پہلے ایک انگریز نے میری معرفت اُسے کوئی دس جانور بنانے کا آرڈر دیا تھا۔" شابُو نے کہا۔ "مُجھے یقین ہے کہ انگریز نے اُسے کوئی لمبی رقم دی تھی مگر ایک تو اُس نے مُجھے صحیح رقم نہ بتائی۔ دوسرے کام میں کوئی ایسا نُقص کر دیا کہ لندن جا کر جب اُس انگریز کو اِس کا پتا چلا تو اُسے سخت غصّہ آیا۔ کوئی سوا مہینے پہلے وہ انگریز یہاں پھر آیا تھا۔ ایک دِن اچانک ایک ہوٹل میں اُس نے مُجھے دیکھا تو دوسرے گاہکوں کے سامنے میری خوب بے عزّتی کی اور پھر جب میں نے الیاس سے شکایت کی تو وہ اُلٹا مُجھ سے لڑنے لگا۔"

"شاید اسی بات کے تین چار دِن بعد اُس نے خُود کُشی کر لی تھی۔ "جاوید نے کہا۔

"ہاں، مر گیا مردود۔ "شابُو نے کہا۔

جاوید کُچھ اور بھی پُوچھنا چاہتا تھا کہ ایک شخص تِیر کی طرح اُن کی میز پر آیا اور آتے ہی مصافحے کے لیے شابُو کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ جاوید اُسے دیکھتے ہی چونک سا پڑا۔ یہ وہی تھا جسے سوسائٹی والے ہوٹل میں اُس نے اخبار کے حاشیوں کا معائنہ کرتے دیکھا تھا۔

"آؤ بھئی رحمان میاں۔ "شابُو نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو۔ آج کچھ دیر کر دی۔ "

"ایک بات ہو گئی تھی۔ "آنے والے نے جاوید اور پرویز پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ بھی ہماری انجمن میں ہیں؟ "

"ابھی تو نہیں مگر آ ہی جائیں گے۔" شابو نے مسکراتے ہوئے میں کہا اور پھر جاوید سے بولا۔ "مجھے کچھ دیر اِن سے باتیں کرتی ہیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے گلبرگ کالونی کی طرف جاؤں گا۔ کہو تو تمہارے گھر ہوتا جاؤں۔ کچھ بات کرنی ہے۔ تم جیسے ہونہار لڑکوں کی اس وقت قوم کو سخت ضرورت ہے۔"

"شوق سے آئیے۔ مگر اس وقت ہمیں اپنے والد کے ساتھ کسی جگہ جانا ہے۔ دس بج رہے ہیں۔ ساڑھے گیارہ سے پہلے گھر واپس نہ جا سکیں گے۔" جاوید نے کہا۔

"تو کیا ہوا۔ گھر میں تالا تو نہیں لگا ہوگا۔" شابُو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں تو۔ امّی اور نصیبن بُوا گھر ہوں گی۔ اگر ہم نہ ہوں تو ڈرائنگ روم میں آرام سے بیٹھ جائیے اور نیولے اور سے دِل بہلائیے۔" جاوید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھّی بات ہے۔ "شابُو نے جاوید کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی تھی۔

"میں آپ کا انتظار کروں گا۔ دوپہر کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔ "جاوید نے ہاتھ ملاتے ہوئے زور دے کر کہا۔ اُس وقت دونوں ایک دوسرے کے اِرادوں سے بے خبر تھے اور دونوں ہی دِل میں اپنی اپنی کامیابی پر ناز کر رہے تھے۔ اِس بات کا کسی کو سان گمان تک نہ تھا کہ دونوں ہی باتوں باتوں میں خطرناک بے احتیاطی کر بیٹھے ہیں۔

خُفیہ دولت

شابُو سے رُخصت ہو کر جاوید اور پرویز ہوٹل سے باہر آئے تو اپنے اسکوٹر کے پاس اُنھیں ایک پُراسرار آدمی کھڑا نظر آیا۔ یہ شخص بڑی بے نیازی کے ساتھ وقفے وقفے سے کبھی دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ جیسے اُس کا کوئی دوست آنے والا ہے لیکن ہر بار کنکھیوں سے وہ شابُو والی میز کو ضرور دیکھتا تھا۔

"اوہ۔ یہ تو کوئی چچا خان کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔" جاوید بُڑبُڑایا تھا۔

”یہ ڈیڈی نے بڑا اچھّا کیا کہ نگرانی کرنے کے لیے آدمی بھجوا دیے۔“ پرویز نے خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں۔ ڈیڈی نے اُسے ہمارا حُلیہ اور اسکوٹر کا نمبر بتا دیا ہو گا۔ اُسی کے ذریعے وہ شابُو کو پہچان کر اُس کی نگرانی کر رہا ہے۔“ جاوید نے کہا اور اِس کے بعد دونوں بھائی اسکوٹر پر بیٹھ کر چل دیے۔

اِس جگہ سے وہ مسجد زیادہ دور نہ تھی جہاں اُنہیں پہنچنا تھا۔ اتّفاق سے مسجد کے دروازے کے قریب اُن کے پہنچتے ہی قریشی صاحب اپنے نائب سمیت وہاں آ موجود ہوئے۔ پروگرام کے مطابق اِن باپ بیٹوں کو یہاں آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہرنا تھا اور یہاں سے اکٹھے ہی کار کے مالک کے پاس جانا تھا۔ لیکن قریشی صاحب نے جاوید کی کامیاب رپورٹ سُن کر یہ پروگرام تبدیل کر دیا۔ مسجد میں وہ کوئی ایک گھنٹے تک امام صاحب اور دوسرے لوگوں سے بات چیت کرتے رہے۔ اِس کے بعد اُنہوں نے

دونوں لڑکوں کو واپس جانے کی ہدایت کی اور خود اپنے نائب کے ساتھ کہیں چلے گئے۔

یہاں سے رُخصت ہو کر دونوں بھائی سوا گیارہ کے قریب گھر پہنچے۔ پھاٹک کے بغلی دروازے کو اُنھوں نے اندر سے بند پایا۔ اُنھوں نے گھنٹی بجائی تو خُود امّی دروازہ کھولنے آئیں۔ اور دروازہ کھولنے سے پہلے اُنھوں نے اچھّی طرح اطمینان کرلیا۔ یہ باتیں لڑکوں کو بڑی عجیب سی معلوم ہوئیں۔

"کیا بات ہے امّی؟ یہ دروازہ کیوں۔۔۔" پرویز اپنا جُملہ پورا نہ کر پایا تھا کہ امّی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"اب یہاں دِن دہاڑے چوری ہونے لگی ہے۔ کوئی لڑکا بِلّی اور نیولا اُٹھا لے گیا۔ کتنی محنت سے میں نے اُن کے بٹّے سِیے تھے۔"

"کتنی دیر ہوئی؟" جاوید نے گھبرا کر پوچھا۔

"آدھے گھنٹے سے زیادہ ہوگیا۔ ساڑھے دس کے بعد کی بات ہے۔ جائیداد ٹیکس کے محکمے کے دو آدمی مکان کی پیمائش کرنے کے لیے آئے تھے۔ ڈرائنگ روم کو ناپنے کے بعد وہ مطالعے کے کمرے کی طرف بڑھے تو میں بھی نصیبن بُوا کو ساتھ لے کر اُن کے پیچھے پیچھے ہولی۔ کمرے میں داخل ہو کر اُنھوں نے ناپنے والا فلیتہ کھولا ہی تھا کہ وہ اُلجھ کر ٹوٹ گیا۔ اِس پر اُس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "جا کے تھیلے میں سے دوسرا فیتہ نکال لاؤ۔" وہ آدمی لپکتا ہوا باہر گیا اور تھوڑی دیر بعد دوسرا فیتہ لے کر واپس آگیا۔ آتے ہی اُس نے مُجھ سے کہا۔

"کیا وہ آپ کا لڑکا ہے؟ نیلی پتلون سفید قمیص پہنے؟"

"کہاں؟ کیا بات ہے؟" میرے مُنہ سے نکلا۔

"وہ بِلّی اور نیولا باہر لیے جا رہا تھا۔"

"مجھے یاد آیا کہ تُم میں سے کوئی بھی آج نیلی پتلون اور سفید قمیص نہیں پہنے ہے۔ میں چیخ پڑی۔ "اُسے پکڑو۔ کوئی اُٹھائی گیرا ہے۔"

دونوں آدمی فیتے فرش پر پھینک کے لپکتے ہوئے باہر نکلے۔ ہم بھی اُن کے پیچھے ہو لیے۔ ایک آدمی جو سب سے آگے تھا ایک طرف اِشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ جا رہا ہے۔ بڑی سڑک کی طرف مُڑ گیا ہے۔ سائیکل پر ہے۔ "ارے پکڑو اِسے۔" میں چِلّائی تو دوسرے آدمی نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "ہمارے پاس موٹر سائیکل ہے۔ آپ اطمینان رکھیے۔ ابھی پکڑتے ہیں؟" پھاٹک سے باہر سڑک کے کنارے ایک پرانی سی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں اُس پر بیٹھے اور چور کے پیچھے دوڑ پڑے۔ جب سے اب تک اُن کا بھی پتا نہیں ہے۔ کُچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا کہ کہیں اور کوئی نہ گھُس آئے۔"

یہ سُن کر دونوں لڑکے چکرا کر رہ گئے۔ کبھی وہ اُسے کسی مَن چلے لڑکے کی کارستانی سمجھتے۔ کبھی اُن کا ذہن الیاس منزل میں ڈاکا ڈالنے والے کی طرف جاتا اور کبھی وہ اُن آدمیوں پر شُبہ کرنے لگتے جو پیمائش کرنے آئے تھے۔

ایک بجے تک وہ بے چینی سے پیمائش کرنے والوں، شابُو اور ڈیڈی کا انتظار کرتے رہے مگر کوئی بھی نہ آیا۔ تھک ہار کر وہ کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔ امّی نے اُنھیں بتایا کہ اُن کی غیر حاضری میں دو ٹیلی فون آئے تھے۔ ایک دس بجے، دوسرا سوا دس بجے۔ پہلا ٹیلی فون دوائیں بنانے والی کسی فیکٹری کے منیجر کا تھا اور دوسرا ٹیلی فون کسی انشورنس ایجنٹ کا تھا۔ دونوں لڑکوں نے اِس بات کو کوئی اہمیّت نہ دی۔ کھانا کھا کر کُچھ دیر وہ ہیم ریڈیو سے اُلجھتے رہے اور پھر اپنے کمرے میں جا کر سو گئے۔

شام کو چھ بجے پروگرام کے مطابق وہ زیبا مینشن میں تھے۔ الیاس کی بیوہ

اور اُس کے مینجر سے بات چیت کر کے آج اِس نتیجے پر پہنچ جانا چاہتے تھے کہ الیاس کے قتل یا خُود کُشی کے سوال پر وہ پریشانی اور جھنجلاہٹ کیوں ظاہر کرتے ہیں؟ الیاس کے چال چلن اور کاروبار کے بارے میں وہ کتنی معلومات رکھتے ہیں؟ کیا الیاس کی زندگی میں یا اُس کی موت کے بعد کسی نے چوری شدہ جانور خریدنے یا چُرانے کی کوشش کی تھی؟ اِن سوالوں کے جواب حاصل کرنے کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور خواہش بھی اُن کے دِلوں میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ آج کسی نہ کسی طرح وہ الیاس منزل کی تلاشی لینا چاہتے تھے۔ مجید کے بیان کے مطابق الیاس نے وہاں دولت چھپا رکھی تھی اور وہ اُس کا سُراغ لگانا چاہتے تھے۔ اس سِلسلے میں وہ بیگم الیاس سے اجازت حاصل کرنے کی کوئی ترکیب سوچ رہے تھے۔

بیگم الیاس سے آدھ گھنٹے کی گفتگو کے بعد اُنہیں اپنے سارے سوالوں کے جواب مل گئے اور جب اُنہوں نے بتایا کہ اُن کے والد بھی ڈکیتی کے

معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں تو وہ اُنہیں دُعائیں دینے لگی۔ اِس موقع پر پرویز نے اپنی بِلّی اور نیولے کے غائب ہو جانے کی بات کہہ دی۔

پرویز کی بات سُنتے ہی بیگم الیاس کُچھ چونکی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آئی۔ وہ بول اُٹھی۔ "یہ اُسی ڈاکو کی کارروائی ہوگی۔" پھر کُچھ سوچ کو اپنے پرس میں سے اُس نے ایک چابی نکالی اور پرویز کے سامنے پھینکتے ہوئے بولیں۔ "تم دِل چھوٹا نہ کرو۔ ابھی الیاس منزل میں کُچھ جانور اور ہیں۔ جاؤ۔ جو بھی جانور تمہیں پسند آئیں لے لو۔"

کُچھ دیر بعد دونوں بھائی وہاں سے نکل کر الیاس منزل کی طرف چل دیے۔

محمدی ہاؤس کی گلی سے نکل کر جب ان کا اسکوٹر میکلوڈ روڈ پر مُڑ گیا تو یہاں سے ایک ٹیکسی بھی ان کے پیچھے ہولی۔ کچہری روڈ میکلوڈ روڈ کراسنگ پر کُچھ دیر کے لیے ٹریفک رُکا تو اتّفاق سے یہ ٹیکسی جاوید کے اسکوٹر کے بالکل برابر کھڑی ہو گئی۔ اُس میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا ہوا کوئی شخص اِس طرح

اخبار پڑھ رہا تھا کہ اُس کا چہرہ بالکل دِکھائی نہ دیتا تھا۔ اِس وقت سے لے کر گورا قبرستان کے چوراہے تک یہ ٹیکسی اُن کے پیچھے چلتی رہی۔ اِس کے بعد تیزی سے آگے بڑھ کر ٹریفک میں گُم ہو گئی۔

الیاس منزل میں داخل ہو کر اُنہوں نے بڑی احتیاط سے ہر فرش اور در و دیوار کو ٹھونک بجا کے دیکھا۔ مگر کہیں بھی خُفیہ خزانے یا دولت چھپائے جانے کے آثار نظر نہ آئے۔ آخر میں ڈرائنگ روم کے زینے سے وہ اوپر اُس بڑے کمرے میں جا پہنچے جس کے نیچے برساتی تھی۔

کمرے میں رکھی ہوئی میزوں اور اُن پر پھیلے ہوئے اوزاروں سے اُنہیں یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ الیاس کی ورکشاپ میں ہیں۔ یہیں ایک دیوار میں تین جانوروں کے بنے ہوئے سر لگے تھے۔ ایک سر بارہ سنگھے کا تھا، ایک ہرن کا اور ایک مُنہ پھاڑے ہوئے خوفناک چیتے کا۔ دیوار کے ساتھ ہی ایک میز تھی جس پر ایک خرگوش اور ایک دھاری دار گلہری رکھی تھی۔

وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میز پر رکھے ہوئے جانوروں میں کسی نہ کسی جگہ ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ دیوار میں لگے ہوئے جانوروں میں کہیں کوئی سُوراخ نہیں تھا اور اُن کے نیچے ایک چھوٹی سی تختی لگی تھی جس پر لکھا تھا "تیّار کردہ الیاس شیخ۔"

وہ خاموشی کے ساتھ کمرے کے درودیوار کا جائزہ لے رہے تھے۔ الیاس منزل کی چار دیواری کے اندر اور باہر ہر طرف گھرا اندھیرا اور سنّاٹا چھایا ہوا تھا مگر ان کم سِن سُراغ رسانوں پر ماحول کی اِس ہیبت کا کوئی اثر نہ تھا۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ایک تڑپا دینے والی چیخ اُن کے کانوں سے ٹکرائی۔ دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ اُنھیں شُبہ تھا کہ کہیں یہ وہم تو نہیں ہے۔ دوسرے ہی لمحے پھر ایک چیخ کی آواز آئی جیسے کوئی سخت مُصیبت میں گرفتار ہو۔ اِکبارگی جاوید کا ذہن مجید کی طرف گیا۔ آواز نیچے کے کسی کمرے سے آ رہی تھی۔

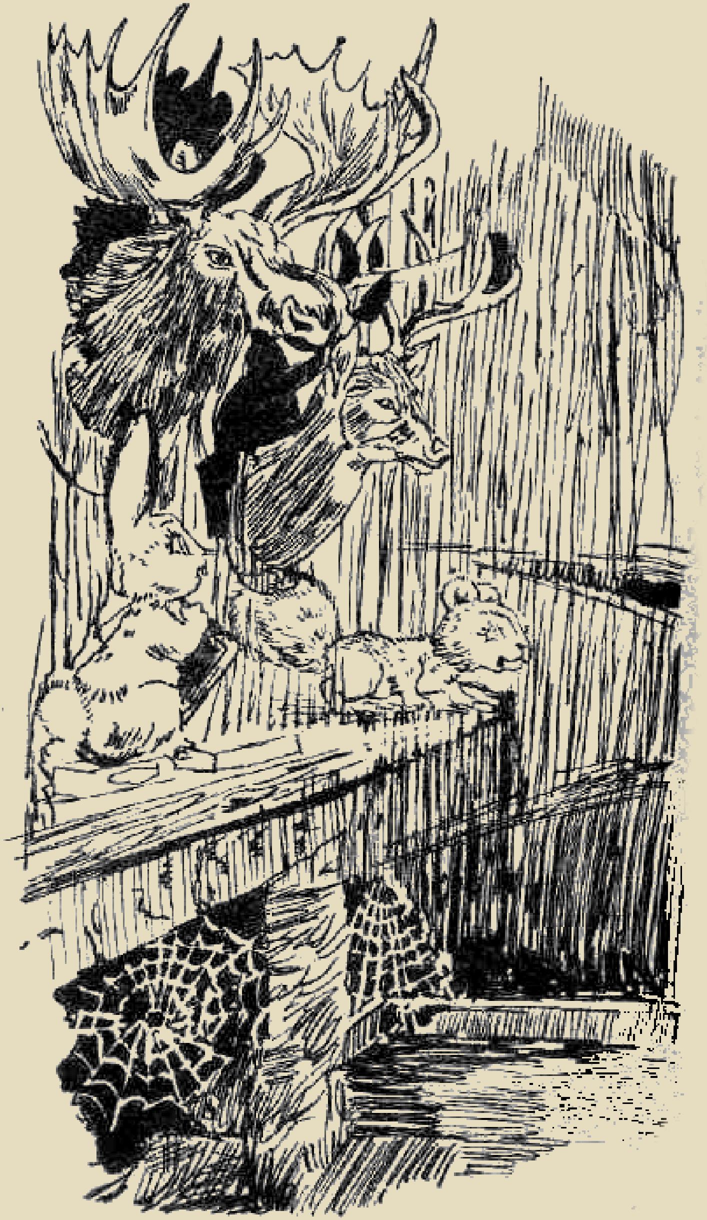

دونوں بھاگتے ہوئے زینے طے کرکے ڈرائنگ روم میں جاپہنچے۔ لیکن وہ چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ اچانک وہ لڑکھڑائے۔ اُن کی ٹارچیں فرش پر گر کر بُجھ گئیں اور پھر مضبوط بازو بھیگا رومال اور کلوروفارم جیسی بُو کے علاوہ اُنہیں کُچھ یاد نہ رہا۔

کُچھ دیر بعد جاوید نے خود کو اتھاہ گہرائی سے اُبھرتا ہوا محسوس کیا۔ پھر اُسے ایسا لگا جیسے وہ ایک گہری نیند سے بیدار ہو رہا ہے اور اُس کا سارا بدن درد کر رہا ہے۔ کُچھ وقفے کے بعد اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس کا ذہن ہر قسم کے خیالات سے خالی تھا۔ چاروں طرف بے مقصد گھورنے کے بعد اچانک اُسے احساس ہوا کہ وہ فرش پر لیٹا ہوا ہے اور ہر طرف اندھیرا ہے۔ اب اُس کے جسم میں گرمی آچُکی تھی اور ذہن کام کرنے لگا تھا۔ وہ بُڑبُڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

جب اُس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو وہ ایک دروازے کی

طرف بڑھا۔ کواڑوں کو پکڑ کر اُس نے کھینچا تو وہ کھل گئے۔ ہوا کا تازہ جھونکا اندر آیا اُس کے حواس پہلے سے بہتر ہو گئے۔ ایک لمحہ دروازے سے باہر دائیں بائیں نگاہیں دوڑانے کے بعد اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ الیاس منزل کے ڈرائنگ روم میں ہے۔ اُسی لمحے اُسے پرویز کا خیال آیا اور وہ کمرے میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔

جلد ہی پرویز بھی اُسے مل گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اُسے بھی ہوش آ رہا تھا۔ جاوید کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ جاوید اُسے اُٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں جاوید ہوں۔ ٹھیک تو ہو نا؟ چوٹ تو نہیں آئی۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" پرویز نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا ہوا تھا؟"

"اندھیرے میں کسی نے ہمیں بے ہوش کر دیا تھا۔" جاوید نے اُس کو

سہارا دیتے ہوئے کہا۔

پرویز کُچھ کہنا چاہتا تھا کہ جاوید نے زور سے اُس کا بازو دبا دیا اور اُچھل کر زینے کے دروازے کے قریب جا پہنچا۔ زینے میں دُھندلی روشنی کی چمک آرہی تھی اور اس کا یہ مطلب تھا کہ اُوپر ورکشاپ میں روشنی ہو رہی تھی۔ الیاس منزل کی بجلی کا کنکشن کبھی کا کٹ چکا تھا۔ جاوید کو یہ روشنی بڑی پُر اسرار لگی۔ کچھ دیر چند سیڑھیاں پڑھ کر وہ خاموشی سے اُوپر کی آہٹ لیتا رہا۔ لیکن جب کسی قسم کا کوئی کھٹکا نہ سنائی دیا تو وہ احتیاط اُوپر چڑھنے لگا۔ پرویز بھی اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔ آخری سیڑھی تھے کر کے جاوید نے پھر کچھ دیر آہٹ کی اور اس کے بعد اندر نگاہ دوڑائی۔ ایک میز پر موٹی سی موم بتی جل رہی تھی۔ کمرے میں کوئی آدمی نہ تھا۔ جاوید تیزی سے اوپر آگیا۔ اب بڑے غور سے کرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

"وہ دیوار پر لگے ہوئے جانور لے گئے۔" پرویز نے اُس کے قریب پہنچ کر

کہا۔ اُسی لمحے جاوید نے میز پر رکھے ہوئے جانوروں پر نگاہ ڈالی۔ خرگوش اور گلہری اپنی جگہ جوں کے توں موجود تھے۔ تو وہ گویا صرف الیاس کے بنائے ہوئے جانوروں کے شوقین ہیں۔ جاوید بڑبڑایا اور پھر پرویز کو اشارہ کر کے بولا۔ "گلہری اور خرگوش اُٹھا لو- چلو۔ اب گھر چلیں-"

"کیوں؟ دولت تلاش نہیں کرو گے؟" پرویز نے کہا۔

"نہیں۔ کوٹھی میں کچھ نہیں ہے۔ اگر الیاس نے دولت چھپائی ہے تو وہ اُس کے بنائے ہوئے جانوروں میں ہے۔"

لان میں اُن کا اسکوٹر کھڑا ہوا تھا۔ پرویز نے کہا۔ "بڑے عجیب ڈاکو ہیں۔ اسکوٹر یونہی چھوڑ گئے۔"

"وہ صرف کام کی چیزوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔" جاوید نے کہا اور اسکوٹر کا انجن سٹارٹ کر دیا۔

ساڑھے آٹھ بجے تک وہ گھر پہنچ گئے۔ گلہری اور خرگوش دیکھ کر امّی بَلّی اور نیولے کا غم بھول گئیں اور دونوں جانور لے کر وہ خُوشی خُوشی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جاوید نے جلدی جلدی ٹیلی فون کیا اور بیگم الیاس کے منیجر کو ساری بات کہہ سُنائی۔ بیگم الیاس اب تک وہیں موجود تھی۔ اس نے افسوس کا اظہار کیا اور جب جاوید نے اُس سے پوچھا کہ کیا پولیس کو اِس کی اِطّلاع دی جائے تو اُس نے اُسے بے فائدہ قرار دیا۔ گویا ورکشاپ سے چُرائے گئے جانوروں کی اُس کے نزدیک کوئی اہمیّت نہ تھی۔

بیگم الیاس کے اس رویّے سے دونوں بھائی اِس نتیجے پر پہنچے کہ وہ اِس بات سے باخبر معلوم ہوتی ہے کہ الیاس نے کہیں کُچھ دولت چھپائی ہے۔ نیلام والے دِن جانوروں کی چوری سے اُسے شبہ ہو گیا ہے کہ دولت جانوروں کے اندر چھپائی گئی ہے۔ اسی لیے وہ ورکشاپ میں الیاس کے باقی جانوروں میں سوراخ کر کے تلاشی لے چُکی ہے۔ چونکہ اُن میں اُسے

کُچھ نہیں نظر آیا اسی لیے وہ جانوروں کو کوئی اہمیّت نہیں دیتی۔ “

”ہوں، تو جانوروں کی چوری خُفیہ دولت تلاش کرنے کے لیے ہو رہی ہے۔ “ پرویز بڑبڑایا۔

”ہاں۔ اور یہ ثابت ہو رہا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اِس راز سے مجید اور الیاس کی بیوہ سے زیادہ باخبر ہے۔ “ جاوید نے کہا۔

”میرا دِل کہتا ہے کہ یہ اُسی انگریز کے کام ہیں جس کا شابُو نے ذکر کیا تھا۔ “ پرویز نے کہا۔

”ہاں۔ ہو سکتا ہے۔ “ پرویز بولا۔ ”وہ انگریز کوئی اسمگلر ہے۔ الیاس نے اُسی کی کوئی دولت چھپالی ہے۔ مگر ہم نے شابُو سے یہ نہیں معلوم کیا کہ وہ انگریز کہاں ہے۔ “

قریشی صاحب اب تک نہ آئے تھے۔ کُچھ دیر اُن کا انتظار کرنے کے بعد

دونوں نے کھانا کھایا اور مطالعے کے کمرے میں جا کر ہیم ریڈیو سے دِل بہلانے لگے۔ گھڑی گھڑی وہ سُوئی کو اُس جگہ لگا دیتے جہاں سے کل اُنھیں آسمانی سرکس کا ڈراما سُنائی دیا تھا، مگر وہاں سنّاٹا تھا۔

دس بجے کے قریب قریشی صاحب آئے تو دونوں بھائیوں نے اُنھیں سارے واقعات کہہ سُنائے۔ آخر میں اُنھوں نے اپنا یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ جانوروں کی چوری کسی دولت کی تلاش کے لیے کی گئی ہے۔

قریشی صاحب اُن کی باتیں سُن کر کُچھ دیر مُسکراتے رہے پھر اطمینان کے ساتھ بولے۔

"سارے معاملے یکجا ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ اصل مجرموں پر ہاتھ ڈالنے میں اب ہمیں ایک دو دِن سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ تمھارا یہ خیال ٹھیک ہے کہ جانوروں کی چوریاں دولت کی تلاش کے لیے کی جا رہی ہیں۔ مجید اور الیاس کی بیوہ کو خُفیہ دولت کا صرف شُبہ ہے اور چوری کرنے

والوں کو اِس کا یقین ہے۔ مُمکن ہے یہ اُسی انگریز یا اُس کے گروہ کے کسی آدمی کا کام ہو جس کا ذکر شابُو نے کیا تھا۔ لیکن شابُو اِس معاملے سے بے خبر نہیں ہے۔“

”یعنی وہ جانوروں کی چوری کرنے والوں کو جانتا ہے؟“ جاوید نے پوچھا۔

”ہاں۔ جانتا ہی نہیں۔ اُن سے سازباز بھی رکھتا ہے۔“

”ہم تو اُسے صرف آسمانی سرکس کا ایک کارندہ سمجھ رہے تھے۔“ جاوید نے کہا۔

”وہ تو خیر ہے ہی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ جانوروں کے چوروں سے بھی تعلّق رکھتا ہے۔ بِلّی اور نیولے کی چوری میں سراسر اُسی کا ہاتھ ہے۔ جو آدمی شابُو کی نگرانی کر رہا تھا اُس نے خبر دی ہے کہ جیسے ہی تم لوگ اُس کے پاس سے اُٹھ کر گئے ہو فوراً اُس نے ہوٹل کے ٹیلی فون سے ایک

خاص نمبر پر کُچھ بات کی تھی۔ تُم بتا چکے ہو کہ حماقت میں تم اُس سے یہ کہہ گئے تھے کہ ساڑھے گیارہ بجے دِن تک گھر میں تمہاری امّی اور ملازمہ کے سوا کوئی مرد نہ ہو گا اور یہ ڈرائنگ روم میں بِلّی اور نیولا رکھے ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شابُو نے ٹیلی فون پر یہی بات کسی کو بتائی تھی اور جانور چوری کرنے والا کوئی لڑکا نہ تھا بلکہ وہی پیمائش کرنے والے بہروپیے تھے۔ دوسرا فیتہ لینے کے لیے جو آدمی باہر گیا تھا وہی نِیولے اور بِلّی کو اپنے تھیلے میں رکھ آیا تھا۔ اور لڑکے کی بات اُس نے یوں کی کہ ایک تو اُس کے تعاقب میں جانے کے بہانے وہ آرام سے رفو چکّر ہو جائیں۔ دوسرے ہنگامہ نہ مچنے پائے۔ ٹیلیفون ایکسچینج سے میں نے وہ نمبر معلوم کر لیا ہے جس سے شابُو نے رابطہ قائم کیا تھا۔ کئی بار میں نے اُس ٹیلیفون پر بات کرنی چاہی مگر غلَط نمبر کہہ کر ٹیلی فون رکھ دیا گیا۔ اب ہمارے آدمی اُس مکان کی نگرانی کر رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر اُن کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آئی اور وہ بولے۔ "لائسنس یافتہ ہیم ریڈیو اور وائرلیس سیٹوں کی دیکھ بھال اور غیر قانونی ٹرانسمیٹروں کی تلاش کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ شاید آسمانی سرکس کے گوریلے کا آلہ کار ہے۔ وہ جِن آدمیوں سے کام لے رہا ہے اُن میں سے کُچھ سامنے آ چکے ہیں اور باقی بھی آج کل میں آ جائیں گے۔ یُوں گوریلے اور بھُس بھرے جانوروں کے چور تک پہنچانے میں شابُو ہمارے لیے بڑا مُفید ثابت ہو رہا ہے۔ مگر یہ اب تک نہ معلوم ہو سکا کہ آسمانی سرکس کا شیر کون ہے اور اُس کا گروہ کیا کام کر رہا ہے۔ کوئی دوسرا پیغام بھی اُن کا سُننے میں نہیں آیا۔ اِسی سے کُچھ۔۔۔۔" وہ یہیں تک کہنے پائے تھے کہ امّی کی آواز سُن کر خاموش ہو گئے۔ وہ چلّا کر کہ رہی تھیں "جاوید، فون ہے۔ ڈیڈی کو بھیجو۔" تینوں باپ بیٹے اُٹھ کر خاموشی سے ڈرائنگ روم کی طرف چل دیے۔

"ہیلو۔ کون صاحب ہیں؟" قریشی صاحب نے پوچھا۔

"میں۔ زبیری بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ارے، تُم؟ اِس وقت؟ خیریت ہے؟" ڈیڈی نے اس طرح کہا جیسے بہت ہی گہرے دوست سے بات کر رہے ہوں۔

"بالکل خیریت نہیں ہے۔ دِن کو بھی فون کر چکا ہوں۔ شام کو خُود آ رہا تھا مگر یہ سوچ کے رُک گیا پتا نہیں گھر ہو گے یا نہیں۔"

"کیا بات ہے کُچھ بتاؤ تو۔"

"بہت نازک معاملہ ہے۔ ملاقات پر ہی بتاؤں گا۔ یا ساڑھے آٹھ صُبح میری فیکٹری میں آ جاؤ یا دوپہر کو کہیں اور وقت دو۔"

"اچھّی بات ہے۔ میں ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پہنچ جاؤں گا۔ اطمینان رکھو۔"

خدائی فوج دار

جاوید اور پرویز اپنے والد کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے تو اُنہوں نے کہا۔

”یہ زبیری صاحب، میرے بچپن کے دوست ہیں۔ چند ماہ ہوئے لندن سے واپس آتے ہیں۔ لانڈھی میں ایک بڑی دواساز فیکٹری کے جنرل منیجر ہیں۔ صبح تم لوگ بھی چلنا ملاقات کراؤں گا۔“

دونوں لڑکوں نے خوشی خوشی سر ہلا کر آمادگی کا اظہار کیا۔ یہ لوگ ڈرائنگ

روم سے جانے ہی والے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بج اُٹھی۔ قریشی صاحب نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔

”جناب پتا چلا ہے۔“ دوسری طرف سے کسی نے کہنا شروع کیا۔ ”کل رات ساڑھے نو بجے کے قریب ایک نامعلوم آدمی شابُو کو برنس روڈ کے ہوٹل سے بلا کو ٹیکسی میں کہیں لے گیا تھا۔ اُس وقت کے بعد وہ آج صُبح آٹھ بجے کے قریب، پمفلٹوں کے بنڈل لیے ہوٹل میں دِکھائی دیا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ کل رات ١١ بجے سے صُبح ٦ بجے تک مشکور اینڈ مشکور کمپنی کے دفتر میں کُچھ لوگ کام کرتے رہے اور چھاپے کی مشین چلنے کی آواز آتی رہی۔ تیسری بات یہ ہے کہ دِن کو تین بجے شابُو نے صدر پوسٹ آفس کے ٹیلی فون پر جس نمبر سے بات چیت کی وہ مشکور اینڈ مشکور کمپنی ہی کا ایک نمبر ہے۔ بس۔“

ٹیلی فون کرنے والا قریشی صاحب کا نائب تھا۔ وہ بغیر رُکے اپنی پورٹ

دیتا رہا۔ جب آخر میں اُس نے لفظ "بس" کہا تو قریشی صاحب بولے۔

"اچھا، مشکور اینڈ مشکور کمپنی کے دفتر پر نگرانی کے لیے کسی آدمی کو مقرّر کر دو۔ کمپنی کے مالک کے گھر کا پتا چلاؤ اور وہاں کی بھی نگرانی شروع کر دو۔ اور سُنو۔ اُس کے ٹیلی فونوں اور دوپہر والے ٹیلیفون کو ٹیپ کرنے کا بھی انتظام کرو۔ بس۔" یہ کہہ کر اُنھوں نے ٹیلی فون رکھ دیا۔

"یہ مشکور کون ہے؟" پرویز نے پوچھا۔

"یہ وہی شخص ہے جس کی کار میں الیاس منزل کے جانور اُڑائے گئے تھے۔"

دونوں لڑکے پھٹی پھٹی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

دوسرے دِن صُبح آٹھ بجے تینوں باپ بیٹے زُبیری صاحب کی فیکٹری جانے کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ چونکہ اُن کا ایک ساتھ گھر واپس آنے

کا پروگرام نہ تھا اس لیے جاوید نے اپنا اسکوٹر اپنے والد کی کار کی ڈِگّی میں رکھ لیا۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے وہ فیکٹری میں پہنچ گئے۔ زُبیری صاحب نے شاید پھاٹک کے چوکیدار کو پہلے ہی سے تاکید کر دی تھی۔ جیسے ہی اُن کی کار پھاٹک میں داخل ہوئی ایک چوکیدار نے کار کو ایک خاص عمارت کی طرف جانے کا اشارہ دیا۔ اُس عمارت کے برآمدے میں ایک چپراسی اور فیکٹری کا کوئی افسر دُور ہی سے دِکھائی دے رہا تھا۔ قُریشی صاحب نے اُن کے قریب پہنچ کر کار روک لی۔

افسر نے بڑھ کر باپ بیٹوں کا استقبال کیا۔ وہ مُسکرانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اُس کی نگاہوں سے بے چینی جھلک رہی تھی۔

"شکر ہے تُم آ گئے"۔ قریشی صاحب کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"خالی میں نہیں آیا۔ یہ دو چھوٹے قریشی بھی لے آیا ہوں۔" قریشی صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ جاوید ہیں اور یہ ہیں پرویز عرف پرّو۔" پھر انھوں نے لڑکوں سے کہا۔ "یہ ہیں تمہارے چچا اور میرے بچپن کے دوست زُبیری۔" لڑکے سلام کر کے مُصافحے کے زُبیری صاحب کی طرف لپکے۔

"اس وقت انہیں نہ لاتے تو اچھا تھا۔" زُبیری صاحب نے بُجھے ہوئے لہجے میں کہا اور دونوں لڑکوں کو بے دِلی کے ساتھ لپٹا لیا۔

"کیوں؟" قریشی صاحب نے کچھ بُرا مانتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ میں تو اِن سے مل کر کچھ نہ کچھ خُوش ہوا ہوں مگر انہیں صرف افسوس ہوگا۔"

یہ سُن کر تینوں باپ بیٹے سٹپٹا سے گئے۔ پھر قریشی صاحب کچھ کہنا چاہتے

تھے کہ زُبیری نے اُن کا بازو پکڑا اور ایک راہداری کی طرف چل دیا۔ دونوں لڑکے خاموشی سے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

ایک موڑ سے گزر کر وہ عمارت کے ایک ایسے برآمدے میں چلنے لگے جس میں فیکٹری کے افسروں کے کمرے تھے۔ ہر افسر کا نام اور عہدہ دروازے کے اوپر ایک تختی پر لکھا ہوا تھا۔ میرے کے قریب ایک کمرے کے اوپر لکھا تھا "پی اے ٹو جنرل مینیجر" اِس سے مِلا ہوا ایک بڑا کمرہ تھا اس پر جنرل مینیجر کی تختی تھی اور دروازے پر صاف سُتھری وردی پہنے ایک چپڑاسی بیٹھا تھا۔ اُس نے کھڑے ہو کر سلام کیا اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

زُبیری نے قریشی صاحب اور بچّوں پر نگاہ ڈالی اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ تینوں باپ بیٹے بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلے گئے اور دروازہ بند کر دیا گیا۔ اب زُبیری اپنی گھومنے والی کرسی پر تھا۔ قریشی صاحب اُس کے

قریب میز کی پہلو والی کُرسی پر تھے اور دونوں لڑکے زبیری کے سامنے والی نشستوں پر۔ اظہر قریشی غور سے زُبیری کر دیکھ رہے تھے اور زُبیری بے چینی کے ساتھ ایک ہاتھ سے اپنے سر کے بالوں کو اُلجھا یا سُلجھا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی کشمکش میں بتلا ہو۔

جاوید اور پرویز کی کیفیّت اُن دونوں سے مختلف تھی اِس وقت نہ وہ اپنے والد کی طرف دیکھ رہے تھے نہ زُبیری کی طرف۔ اُن کی نگاہیں ایک خاص چیز پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ ایک خوب صورت اور تندرست بُل ڈاگ نسل کا کُتّا تھا۔ وہ زُبیری کی کُرسی کے پیچھے دیوار سے لگا سیدھا کھڑا تھا اور بغیر پلک جھپکاتے لڑکوں کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ "قُریشی میں نے ایک بہت بڑا جُرم کیا ہے۔" اچانک زُبیری نے تھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ دونوں لڑکے کُتّے سے نگاہیں ہٹا کر اُن کی طرف متوجّہ ہو گئے۔ زُبیری نے حوصلہ پا کر میز پر کُہنیاں ٹکائیں اور اظہر قُریشی کو گھورتے ہوئے کہنے لگا۔

ہماری کمپنی کی بعض دواؤں کی مُلک کے اندر اور مُلک کے باہر زبردست مانگ ہے۔ فیکٹری کا موجودہ پلانٹ اُس مانگ کا تہائی حصّہ بھی پورا نہیں کر سکتا۔ نئے پلانٹ کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں۔ لیکن ڈیڑھ دو سال سے پہلے کامیابی ہونا مشکل ہے۔

کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر کے اشارے پر میں نے ایک مُجرمانہ منصوبہ بنایا۔ اِس منصوبے میں فیکٹری کے تین کیمسٹ میرے شریک ہیں۔ ہم نے ایک ایک بات تفصیل سے طے کی۔ اب گزشتہ دو ماہ سے ہمارے یہاں مشہور دواؤں کی پیداوار پہلے سے تین گُنی ہو گئی ہے۔ لیکن اِس طرح کہ یا تو ان میں بعض گھٹیا اجزا کی ملاوٹ کر دی گئی ہے یا قیمتی اجزا کی مقدار کم کر دی گئی ہے۔ یہ کہہ کر زبیری صاحب نے کُچھ دُم لیا۔

”ہاں، پھر؟“ قُریشی صاحب نے زبیری کو بات جاری رکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور اب۔ " زُبیری نے ہونٹ چباتے ہوئے نفرت کے لہجے میں کہا۔

"اب ایک پُراسرار شخص میرے اس جُرم سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ دوپہر کو اُس نے خُدائی فوج دار کے نام سے مُجھے ٹیلی فون کیا۔ اُس نے کہا کہ دو ماہ سے ہمارے یہاں دواؤں میں جو ملاوٹ کی جا رہی ہے وہ اُس کی ایک ایک تفصیل سے واقف ہے۔ ثبوت کے طور پر اس نے بعض ایسی باتوں کا حوالہ دیا جو اِسی کمرے میں بڑی رازداری کے ساتھ میرے اور فیکٹری کے تین کیمسٹوں کے درمیان ہوتی رہی ہیں۔ آخر میں اُس نے مُجھے دو شرطیں پیش کیں اور یہ دھمکی بھی دی کہ اگر پانچ دِن کے اندر دو میں سے ایک شرط نہ پوری کی گئی تو حکومت کو اِطّلاع دے دی جائے گی۔ "

یہ کہہ کر زُبیری پریشانی کے ساتھ اپنے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اظہر قریشی بدستور پُرسکون تھے۔ اُدھر قریشی بدستور پُرسکُون تھے البتّہ جاوید اور پرویز کی نگاہوں سے حقارت جھلکنے لگی تھی۔

ایک لمحہ بعد زُبیری خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "ایک شرط یہ ہے کہ پانچ لاکھ روپے ادا کیے جائیں۔ اِس سِلسلے میں ہمیں قِسطوں کی سہولت دی جا سکتی ہے۔ اور دُوسری شرط میں کئی باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کم از کم دس ہزار روپے ماہانہ خرچ کر کے میں شہر کے مختلف حصّوں میں پانچ جلسوں کا اہتمام کیا کروں۔ اِن جلسوں میں صرف وہ لوگ تقریر کریں جو بعض سیاسی جماعتوں کے پروگرام کو کُفر قرار دیں اور اُس کے حامیوں کے خلاف عوام کے مذہبی جذبات بھڑکائیں۔ دُوسرے پانچ ہزار روپے ماہانہ کم از کم ایسے پچاس لوگوں پر خرچ کیے جائیں جو مسجدوں، چائے خانوں، پنواڑیوں اور حجاموں کی دُکانوں، بسوں اور ٹرینوں وغیرہ میں خاص قسم کا پروپیگنڈہ کیا کریں۔ تیسری بات یہ کہ پانچ ہزار روپے ماہوار ایسے لوگوں پر خرچ کیے جائیں جو بعض سیاسی جماعتوں کے ادیبوں، شاعروں اور پُرجوش کارکنوں کے خلاف اُن کے پڑوس میں

محاذ بنائیں۔ شاعروں اور مذہبی و سیاسی جلسوں جلوسوں میں ہنگامہ کریں۔ اس دوسری شرط کو دین کی خدمت کہتا ہے۔ مگر یہ شرط مُجھے ہرگز منظور نہیں۔"

اظہر قریشی صاحب کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آ گئی تھی۔ دھیمے لہجے میں اُنھوں نے کہا۔

"اگر یہ شرط تمہیں منظور نہیں تو تمہارے سامنے صرف دو ہی راستے ہیں۔ یا خُدائی فوج دار کی پہلی شرط مانو یا پھر اپنے جُرم کا نتیجہ بھُگتنے کے لیے تیّار ہو جاؤ۔ ویسے دوسری شرط پہلی سے آسان بھی ہے اور اِس میں رقم بھی پانچ لاکھ کے بجائے دو لاکھ چالیس ہزار خرچ ہو گی۔"

زُبیری جواب میں کُچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ کان سے رسیور لگا کر اُس نے کہا۔ "جی ہاں۔ بول رہا ہوں۔ آپ کون صاحب ہیں؟"

جواب میں دُوسری طرف سے جو کُچھ کہا گیا وہ زبیری کے علاوہ دوسرے نہ سُن سکے مگر اُس کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ کوئی اہم بات ہے۔ مری ہوئی آواز ہُوں ہاں کرنے کے علاوہ زُبیری کُچھ نہ بول رہا تھا۔ دُوسری طرف سے سِلسِلہ ختم کیا گیا تو زُبیری نے ٹیلی فون رکھ دیا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔

"کیا خُدائی فوج دار کا فون تھا؟" یہ اظہر قریشی نے زبیری کو گھُورتے ہوئے پُوچھا۔

زُبیری نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہاں۔ کہہ رہا تھا۔ تُم نے بات دوسروں پر ظاہر کر دی ہے۔ اِس لیے اپنی دوسری شرط واپس لیتا ہوں۔ اگر تُم نے اور دھوکا دینے کی کوشش کی تو پہلی شرط بھی واپس لے لوں گا۔ کل رات بارہ بجے تک تین لاکھ روپے کا انتظام کر لو اور میری ہدایت کا انتظار کرو۔ باقی دو لاکھ ہم چھ ماہ بعد لیں گے۔ یہ رعایت

صرف رازداری کی شرط پر ہے اگر تُم نے کوئی شرارت کرنی چاہی تو سمجھ لو نہ تمہاری کوئی بات ہم سے پوشیدہ رہ سکتی ہے اور نہ دُنیا کی کوئی طاقت تمہیں تمہارے جُرم کی سزا سے بچا سکتی ہے۔"

کمرے میں کُچھ دیر سنّاٹا چھایا رہا۔ پھر اظہر قریشی کُچھ سوچ کر جاوید اور پرویز کے پیچھے سے چکّر کاٹتے ہوئے کھڑکی کے قریب پُہنچ گئے اور اُس کے پٹ کھول کر دائیں بائیں جھانکنے لگے۔ اُسی وقت جاوید اور پرویز کی نگاہ پھر کُتّے پر جا پڑی۔ کھڑکی اُس کُتّے کے اُوپر ہی تھی اور اُس کے قریب کھڑے ہونے کی وجہ سے اظہر قُریشی کی دائیں ٹانگ اُس کے سر سے مَس ہو رہی تھی۔ پرویز اور جاوید کو اب اِس بات میں کوئی شُبہ نہ رہا کہ یہ کُتّا زندہ نہیں ہے۔

کھڑکی بند کر کے اظہر قریشی نے کہا۔ "ٹیلی فون سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تمہاری کڑی نِگرانی کی جا رہی ہے۔ اور تُم کہتے ہو اِس خُدائی فوج دار

کو تمہاری وہ باتیں بھی معلوم ہیں جو تُم نے صرف اپنے تین کیمسٹوں سے کی ہیں۔ کیا یہ مُمکن نہیں کہ اِن میں سے کوئی خُدائی فوج دار سے ملا ہوا ہو؟"

"میں یہ یقین نہیں کر سکتا۔" زُبیری نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ اِن تینوں کا نفع میں حصّہ رکھا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ دواؤں کو مِعیار کے مطابق تیّار کرنا اُن کی ذمّے داری ہے۔ اگر مُعاملہ حُکّام کے عِلم میں لایا گیا تو بازار میں موجود ہمارے سٹاک کے کیمیائی تجزیے سے آسانی کے ساتھ ملاوٹ ثابت ہو جائے گی اور اُن میں سے کوئی بھی سزا سے نہیں بچ سکے گا۔"

اظہر قُریشی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "اب میں چلتا ہوں۔ تمہارے پاس کل رات بارہ بجے تک کا وقت ہے۔ میں کل شام تک ضرور تمہیں کوئی مناسب رائے دے سکوں گا۔ ویسے تُم نے سنگین جُرم کیا ہے۔ تمہیں اس کی سزا ملنی چاہیے۔ لیکن تُم نے خُدائی فوج دار کی

دوسری شرط نامنظور کر کے مُجھے اِس سے باخبر کیا ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ مُمکن ہے تمہیں اِس سے فائدہ پہنچے۔ بہر حال کل شام تک میرا انتظار کرو۔"

تینوں باپ بیٹے زُبیری سے رُخصت ہو کر شہر کی طرف چل دیے۔ راستے میں ایک جگہ جاوید اور پرویز گھر کی طرف چلے گئے اور اظہر قریشی کہیں اور۔

ایک بات

جاوید اور پرویز کو گھر پہنچے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ کسی نے گھنٹی بجائی۔ پرویز نے دروازہ کھولا۔ مجید سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

”آؤ مجید، ہم اس وقت تمھیں ہی یاد کر رہے تھے۔“ پرویز بولا۔

”میں ایک خاص خبر لے کر آیا ہوں۔“ مجید نے کہا۔

”خیریت؟“ پرویز بولا۔

”میں کل رات الیاس ماموں کے مکان پر گیا تھا۔ “ مجید اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ پرویز چلتے چلتے رُک گیا اور حیرت کی نگاہوں سے مجید کو گھورتے ہوئے بولا۔

”تُم رات وہاں تھے؟ کس وقت؟“

”نو بجے کے قریب۔ “ مجید جلدی سے بولا۔ ”کوئی وہاں کے بچے کھُچے سارے جانور اُٹھا کر لے گیا۔ “

”اوہ۔ ہاں۔ “ پرویز نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”دو جانور وہاں سے ہم لے آئے ہیں۔ “

”تُم؟ کیا تُم وہاں گئے تھے۔ “ مجید نے حیرت سے کہا۔

جواب میں پرویز نے اُسے اپنی ساری آپ بیتی کہہ سُنائی۔ دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچے تو جاوید بھی آگیا۔ تینوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ جاوید نے

مجید کو بِلّی اور نیولے کی چوری کی بھی خبر سُنائی اور کہنے لگا۔

"تُم کو اور تمہاری مُمانی کو شُبہ ہے کہ الیاس مرحوم نے کہیں دولت چھپائی ہے۔ ہم پورے مکان کی تلاشی لے چُکے ہیں۔ ہمیں وہاں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی جس پر شُبہ کر سکتے۔ ہمارا خیال ہے کہ تمہاری طرح اِس راز سے کوئی اور بھی واقف ہے۔ اُسے یقین ہے کہ دولت مکان میں نہیں بلکہ مرحوم کے بنائے ہوئے کسی جانور کے اندر چھپائی گئی ہے۔ تین دِن کے اندر جانور چُرانے کی تین وارداتیں اِسی بنیاد پر کی گئی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اب تقریباً وہ سارے جانور اِس پُر اسرار شخص کے ہتھّے چڑھ چُکے ہیں۔ جو تمہارے ماموں مرنے کے بعد چھوڑ گئے تھے۔ کیا ایسا کوئی جانور تمہارے گھر میں یا کہیں اور ہے؟"

"ہمارے گھر میں تو نہیں۔ اور کا پتا نہیں۔" مجید نے جواب دیا اور پھر حسرت کے ساتھ کہنے لگا۔ "اگر خزانہ کسی جانور کے اندر رہا اور ماموں کے

چھوڑے ہوئے جانور بھی اتنے ہی ہوئے تو پھر تو وہ چور کو مِل گیا ہو گا۔ "

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔ " جاوید نے کہا۔ "چور کے قبضے میں پہنچے ہوئے کسی ایک جانور میں بھی خزانہ نہیں۔ نیلام والے دِن چرائے ہوئے جانوروں میں مال مِل جاتا تو ہماری بِلّی اور نیولے کو نہ چرایا جاتا اور اگر اِن دونوں سے مطلب پورا ہو جاتا تو مرحوم کی ورکشاپ کے جانور ہرگز نہ چرائے جاتے، رات ورکشاپ سے جو جانور چوری ہوئے ہیں اُن میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ تمھاری مُمانی اُن کی پہلے ہی تلاشی لے چکی تھیں۔ "

"پھر تو دولت مکان ہی کے اندر کہیں ہوگی۔ " مجید نے خوش ہو کر کہا۔

"مُمکن ہے۔ مگر اب نہیں۔ وہاں رات کو ہرگز نہیں جانا چاہیے۔ " جاوید نے کہا۔

"تو چلو ابھی چلیں۔ پونے دس بجے ہوں گے۔ دوپہر تک چپّہ چپّہ دیکھ ڈالیں

گے۔ ‘‘ مجید نے جوش سے کہا۔

’’کُچھ کیک پیس اور پیسٹریاں کھا کے تینوں الیاس منزل پہنچ گئے۔ دو بجے تک اُنھوں نے سارا مکان کھنگال ڈالا۔ کہیں کُچھ نہ ملا۔ آخر دو بجے کے قریب جب وہ بھوک سے بِلبلا اُٹھے تو تھک ہار کر وہاں سے نکلے۔ صدر میں آ کر اُنھوں نے ایک ایک کپ فروٹ آئس کریم کھایا۔ وہاں سے مجید بس میں بیٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔ جاوید اور پرویز الیاس منزل کی چابی واپس کرنے زیبا مینشن جا پہنچے۔ وہاں بیگم الیاس کے مینجر کے دفتر میں اُن کی اُمید کے مطابق سوائے چپراسی کے اور کوئی نہ تھا۔ چابی اور دو جُملے شکریہ کا ایک خط چپڑاسی کے حوالے کر کے وہ گھر آ گئے۔ پھر جو وہ کھانا کھا کر سوئے ہیں تو ساڑھے پانچ بجے سے پہلے اُن کی آنکھ نہ کھل سکی۔

شام کو نیو کراچی روڈ کے سبز جزیروں پر چہل قدمی کرتے ہوئے وہ زبیری کے معاملے پر غور کر رہے تھے۔

"یہ خُدائی فوج دار مُجھے عام قسم کا غنڈہ نہیں معلوم ہوتا۔" جاوید نے کہا۔ "اُس کی دوسری شرط سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ پیسے کے مقابلے میں وہ ایک خاص قسم کے کام کو زیادہ اہمیّت دیتا ہے۔"

"پھر تو وہ کسی ایسے ہی گروہ کا آدمی معلوم ہوتا ہے جس کی فکر میں ڈیڈی لگے ہوئے ہیں۔" پرویز بولا۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ خُدائی فوج دار کو اس بات کا کیسے یقین ہو گیا کہ زُبیری نے اُس کی بات دوسروں پر ظاہر کر دی ہے۔ تمھیں یاد ہو گا، اُس کا ٹیلی فون عین اُس وقت آیا تھا جب زُبیری ڈیڈی کو ساری بات بتا چُکا تھا۔ پھر زبیری نے یہ تبھی بیان کیا تھا کہ وہ اُن راز کی باتوں سے بھی آگاہ ہے جو اُس نے اپنے کیمسٹوں سے کی تھیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ باتیں کسی کیمسٹ نے خدائی فوج دار تک پہنچا دی ہیں تو جب زُبیری ہم لوگوں سے بات کر رہا تھا تو اُس وقت کوئی کیمسٹ وہاں موجود نہ تھا۔ پھر زُبیری کی بات اُس تک کیسے پہنچ گئی۔

دونوں بھائی اِس معاملے پر کُچھ دیر غور کرتے رہے۔ اس کے بعد گھر جا کر ہیم ریڈیو سیٹ کھول کر بیٹھ گئے۔ وہ آسمانی سرکس کے پیغامات سُننے کے لیے بے چین تھے۔

جاوید آدھ گھنٹے تک ڈائل کی سوئی کو اِدھر اُدھر نچاتا رہا مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔ تھک ہار کے ڈائل کی سوئی کو ایک جگہ چھوڑ کر اُس نے ہیم کا سوئچ بند کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ عین اُسی موقع پر لاؤڈ اسپیکر آسمانی سرکس کا سگنل سُنانے لگا۔ جاوید نے جلدی سے ٹیپ ریکارڈ چلا کر اِس کا مانک لاؤڈ سپیکر کے سامنے رکھ دیا۔

ہنزوں کی شڑاپ شڑاپ اور جانوروں کی آوازوں کے ساتھ اِس بار ہیم پر جو باتیں سُنائی دیں اُن کا خلاصہ یہ ہے۔ گوریلے نے رِنگ ماسٹر کو سارے کام ٹھیک ٹھیک ہونے کی رپورٹ دی۔ رِنگ ماسٹر نے اسے کُچھ اور مقدس پتّیاں الاؤ میں ڈالنے اور کاغذ کی آگ میں اضافہ کرنے کی ہدایت کی۔

شیر نے بھاگے ہوئے شکار کو پکڑنے اور چھُپے ہوئے شکار ڈھونڈھ نکالنے کی خبر دی مگر یہ بھی کہا کہ گوشت اور خُون نہیں ملا۔ نئی بات یہ تھی کہ ایک تو گوریلے سے کہا گیا کہ اُونٹ سے زیادہ مینگنیاں لو اور انہیں الاؤ میں ڈالتے جاؤ۔ دوسرے شیر سے کہا گیا کہ وہ وفادار کتّے کو کھا لے۔ اور اُس کی جگہ کسی اور سے کام لے۔

یہ نئے اشارے جاوید اور پرویز کی سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ وہ بے چینی کے ساتھ ڈیڈی کا انتظار کرنے لگے۔ آخر جب رات گیارہ بجے تک وہ نہ آئے اور نیند سے اُن کی آنکھیں بھاری ہونے لگیں تو وہ سو گئے۔

صُبح ناشتے کے وقت اُنھوں نے رات کی ساری کارگزاریوں سے ڈیڈی کو آگاہ کیا۔ اُنہیں اُمّید تھی کہ جواب میں ڈیڈی بھی اُنہیں اپنی اس وقت تک کی کاروائیاں بتائیں گے۔ لیکن آسمانی سرکس کا ٹیپ سُن کر وہ اپنے خیالات میں گم ہو گئے۔ اُنھوں نے ٹیپ کے ایک حصے کو تین بار سُنا۔

آخری بار سننے کے بعد بھی وہ کچھ دیر خاموشی کے ساتھ سوچتے رہے پھر بولے ۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُونٹ، مینگنی اور وفادار کُتّے کے بارے میں اس پیغام سے پہلے وہ کسی وقت کوئی نہ کوئی بات کر چکے ہیں ۔ تمھیں دوپہر اور شام کے علاوہ صبح کے وقت بھی اُن کی بات چیت سننے کی کوشش کوئی چاہیے ۔ ان چیزوں کے بارے میں اُن کی پہلی گفتگو ہم نے سنتی ہوتی تو یقیناً ہمیں بڑی مدد ملتی ۔ ہم کوئی نہ کوئی رائے قائم کر سکتے مگر ۔ ۔ ۔"

وہ آنا ہی کہہ پائے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ قریشی صاحب نے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر ٹیلی فون کان سے لگا لیا۔ جاوید اور پرویز اُن کے پیچھے تھے ۔ جی ۔ میں بول رہا ہوں ۔ اور آپ ؟ کہیے خیریت ؟ ہائیں کب ؟ ایں ؟ وہی جو آپ کے کمرے میں تھا، اچھا میں ابھی آتا ہوں ۔ "جاوید اور پرویز سمجھ گئے کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے ۔ کس جگہ ؟ یہ بات ابھی وہ سوچ ہی

رہے تھے کہ ڈیڈی نے اُن سے کہا ۔ زبیری صاحب کے دفتر میں رات چوری ہوگئی ہے ۔ تم کار نکالو۔ جب تک میں کپڑے تبدیل کرلوں ۔"

چند منٹ بعد وہ آکر کار میں بیٹھنے لگے تو جاوید نے پوچھا : "ڈیڈی کیا چوری ہوا ہے ؟"

"کُچھ کاغذات اور فائل ۔ اور ایک بھُس بھرا کُتّا۔" اُنھوں نے کہا اور کار آگے بڑھا دی ۔

رات والا پیغام سُننے کے بعد جاوید کو اِس بات کا یقین ہو گیا کہ اُس وقت تک بھُس بھرے جانوروں کی جتنی چوریاں ہوئی ہیں وہ سب آسمانی سرکس کے شیر کا کام ہے۔ زُبیری کے کُتّے کی چوری کی بات سُنتے ہی ٹھیک سے اُس کے دماغ میں یہ بات آئی کہ ہو نہ ہو یہ بھی اُسی کی حرکت ہے ۔ یہ سوالات البتّہ پھر بھی اُس کے دماغ میں چکّر کاٹتے رہے کہ رِنگ ماسٹر نے اُس کُتّے کو وفادار کُتّا کیوں کہا ہے ۔ اُس کا کام کسی اور سے لینے

کی ہدایت کیوں کی۔ یہ کُتّا آخر کیا کام کر رہا تھا؟ اگر وہ جانوروں میں صرف دولت تلاش کر رہے ہیں تو ایک لفظ خون یا گوشت کے بجائے وہ دونوں الفاظ ایک ساتھ کیوں استعمال کرتے ہیں؟ کیا دولت کے علاوہ بھی وہ کسی اہم چیز کو اِن جانوروں میں ڈھونڈ رہے ہیں؟

قریشی صاحب کے جانے کے بعد اُنھوں نے پھاٹک بند ہی کیا تھا کہ مجید آ گیا۔ اُسے دیکھتے ہی پہلی بار جاوید کو شُبہ ہوا کہ کہیں یہ لڑکا اُن کا بھید لینے کے لیے تو نہیں پیچھے لگا ہوا ہے؟ اِس شُبے کے بعد جاوید یہ مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ اُسے ہیم ریڈیو سُننے کا موقع دیا جائے۔ کُچھ دیر وہ اُس سے باتیں کرتا رہا۔ اُس کی باتیں آج کُچھ ایسی اُکھڑی اُکھڑی تھیں کہ مجید کو اپنی بات کہنے کا حوصلہ نہ ہو سکا۔ پرویز بھی جاوید کا رویّہ بھانپ کر مجید کو دوسری باتوں میں اُلجھاتا رہا۔ آخر جاوید ایک ضروری کام کا بہانہ بنا کر مطالعے کے کمرے میں چلا گیا اور ہیم ریڈیو کھول کر ڈائل کی سوئی کو اِدھر اُدھر گُھمانے لگا۔

اُس کے جاتے ہی پرویز نے مجید کو ٹالنے کی غرض سے کہا۔ "میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ نہ کوئی خُفیہ دولت تمہارے ماموں کے مکان میں ہے نہ اُن کے بنائے ہوئے جانوروں کے اندر۔ اُنھوں نے شاید تمھیں خوش کرنے کے لیے ایسی بات کہی تھی۔ بہتر ہے اب خیال کو ختم کر دیا جائے۔"

"میں رات بھر یہی سوچتا رہا ہوں۔" مجید نے کہا۔ "مُجھے ایک نیا خیال آیا ہے۔ اِسی لیے میں اس وقت آیا ہوں۔ میرا دل کہتا ہے۔ ماموں کی بات غَلط نہیں۔ بے شک اُن کے مکان اور جانوروں میں کُچھ نہیں مگر دولت ہے ضرور۔"

"تو کیا وہ آسمان یا ہوا میں چھُپی ہوئی ہے؟" پرویز نے کہا۔

"نہیں۔ البتّہ کسی ایسی چیز میں ضرور ہو سکتی ہے جو اِس وقت اِس کمرے میں ہے۔ ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر ہے اور ہماری نگاہوں کے

سامنے ہے۔"

یہ کہہ کر مجید نے شوکیس پر رکھی ہوئی گلہری اور خرگوش کو دیکھا۔ پرویز کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ کچھ دیر وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی مجید کو اور کبھی جانوروں کو دیکھتا رہا۔ پھر لپک کر اُس نے دونوں جانور اُٹھائے اور مجید کو ساتھ لے کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ جاوید بھاگتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ اُس کا چہرہ جوش سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اُس نے ٹیلیفون پر زُبیری کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے اُن کے پی اے کی آواز آئی تو جاوید نے کہا۔

"ڈیڈی، زبیری صاحب کے کمرے میں ہیں۔ جلدی سے فُون اُنہیں دے دو۔ بہت ضروری بات ہے۔" اک ثانیہ کے بعد دوسری طرف سے ڈیڈی کی آواز آئی تو جاوید نے جوش سے کہا۔ "ڈیڈی ہوشیار! ہیم ریڈیو پر آپ کی باتوں کی آواز آ رہی ہے۔" بات ختم کر کے جاوید نے ٹیلی فون

رکھا ہی تھا کہ پرویز اور مجید خوشی سے چیختے ہوئے آ دھمکے۔ "جاوید، یہ دیکھو۔ خرگوش کے پیٹ سے یہ چیزیں نکلی ہیں۔" پرویز کہہ رہا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں مٹر اور مونگ جتنے تین چمک دار ہیرے تھے اور دوسرے ہاتھ میں تین کاغذ۔

دھوکا

کوئی دوسرا موقع ہوتا تو شاید جاوید بھی اتنی بڑی کامیابی پر اُچھل پڑتا۔ پر ہیم ریڈیو پر اچانک ڈیڈی کی آواز سُن کر اُسے جو حیرت ہوئی تھی اُس کے اثر سے ابھی اُس کا ذہن آزاد نہ ہوا تھا۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ اُسے اِن ہیروں کی صحیح قیمت کا اندازہ نہ تھا۔

ہیروں سے کرنیں پھُوٹ رہی تھیں۔ اُن کا لطف اٹھانے کے لیے پرویز کبھی مٹھی کھول رہا تھا کبھی بند کر رہا تھا۔ مجید کے چہرے پر خوشی کے ساتھ

ساتھ فخر بھی جھلک رہا تھا۔ چند ثانیے ہیروں کو دیکھنے کے بعد جاوید نے پرویز سے کاغذات لیتے ہوئے کہا۔ "ہیروں کو کسی چھوٹی شیشی یا ڈبّہ میں رکھ لو۔"

پرویز مجید کو ساتھ لے کر اندر چلا گیا اور جاوید کاغذات پر نگاہ ڈالنے لگا۔ اُن میں سے ایک ورق اُردو میں تھا۔ یہ وہی پُر اسرار ہدایت نامہ تھا جس کی ایک نقل وزارتِ خارجہ کے اعلیٰ افسر زمان صاحب نے اُس کے ڈیڈی کو دِکھائی تھی۔ جاوید اِس واقعے سے واقف نہ تھا۔ وہ اِس کا مطلب تو نہ سمجھ سکا مگر اُس کی ساری عبارت اُس کے ذہن پر نقش ہو گئی۔ دوسرے دو ورق الیاس شیخ کے رائٹنگ پیڈ کے تھے اور باریک حروف میں انگریزی میں لکھے ہوئے تھے۔ تحریر کُچھ ایسی تھی کہ جاوید اُس کی عبارت صاف نہ پڑھ سکا۔ البتّہ جگہ جگہ بڑے حروف میں کُچھ سُرخیاں تھیں۔ اُن پر توجّہ دینے سے یہ بات اُس کی سمجھ میں آ گئی کہ الیاس شیخ نے اس میں آسمانی

سرکس، اُس کے مقصد اور لیڈروں اور کارندوں کے بارے میں کُچھ لکھا ہے۔

چند لمحے بعد پرویز اور مجید آ گئے۔ پرویز ہیروں کو ایک شیشی میں بند کر کے لے آیا۔ جاوید نے کاغذات تہہ کو کے پتلون کی پیچھے کی جیب میں رکھ لیے اور ہیروں والی شیشی پرویز سے لے کر سامنے کی جیب میں اُڑس لی۔ "چلو۔ ڈیڈی کو چل کر بتائیں۔" مجید کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جاوید بولا۔ دونوں دروازے کی طرف بڑھے تو پرویز بولا۔ "میں امّی سے کہہ آؤں۔ وہ بھاگتا ہوا اندر گیا اور جلد ہی واپس آ کر بولا۔ "چلو۔ کیا اسکوٹر پر چلو گئے؟"

"نہیں ٹیکسی کرلیں گے۔ لمبا سفر ہے۔ اسکوٹر میں تینوں چلے تو تکلیف ہو گی۔" جاوید نے کہا۔

تینوں لڑکے ابھی ڈرائنگ روم سے باہر نکلے ہی تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ سب ٹھٹھک گئے۔ جاوید جھپٹ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔

”ہیلو، میں جاوید بول رہا ہوں۔ کون صاحب ہیں؟“

”میں محمد اسلم ہوں۔ الیاس کی بیوہ کا منیجر۔“ دوسری جانب سے کسی نے کہنا شروع کیا۔ ”تھوڑی دیر ہوئی ایک آدمی آیا تھا اور جوزف ہنٹر سِڈنی کے جانوروں کے مُنہ مانگے دام دینے کو کہہ رہا تھا۔ ہم نے آپ کا پتا دیا۔ بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ آپ اُس کے ہاتھ ہرگز نہ بیچیے۔ جو دام وہ لگائے اِس سے دس بیس زیادہ دے کر ہم خود لے لیں گے۔“

جاوید ابھی سوچ بھی نہ پایا تھا کہ کیا جواب دے کہ اُس نے بُڑبُڑاتے ہوئے کہا۔ ”اچھّا، دیکھیے صاحبہ خود بات کر رہی ہیں۔“

بیگم الیاس کہنے لگیں۔ ”وہ بیٹا، بات یہ ہے کہ سارے جانور چوری ہو چکے۔ مرحوم کو وہ دونوں جانور جو تُم لے گئے ہو بہت پسند تھے۔ میرا دِل رات سے مچل رہا ہے کہ اُن کی یہ یادگاریں میں اپنے ہی پاس رکھوں۔ تم بُرا نہ مانو تو یہ مُجھے لوٹا دو۔ بیچنا چاہو تو جو دام دوسرا لگائے اُس سے دس

بیس زیادہ دُوں گی۔ بیٹے، انہی کو دیکھ کر دُکھیا دِل بہلا لیا کروں گی۔"

آخری فقرہ کہتے ہوئے اُن کی آواز بھرّا گئی تھی۔ جاوید سمجھ گیا کہ پُراسرار گاہک جس کا ذکر کیا گیا ہے شیر گروہ کا ہی کوئی آدمی ہے اور اب اِن دونوں کو شُبہ ہو گیا ہے کہ مرحوم الیاس کی چھپائی ہوئی دولت جوزف ہنٹر کے بنائے ہوئے خرگوش اور گلہری ہی میں ہو سکتی ہے۔ جاوید نے اطمینان کے ساتھ کہا۔

"مگر محترمہ، ہم تو اُن جانوروں کو چیر پھاڑ چکے ہیں۔"

"ارے!" بیگم الیاس چیخ پڑیں اور پھر لرزتی ہوئی آواز میں اُنہوں نے پوچھا۔ "کیا نکلا؟"

"مٹر اور مونگ جتنے تین چمک دار ہیرے۔" کاغذات کا ذکر کرنا جاوید نے مناسب نہ سمجھا۔

"ہائیں۔ " اُن کی بیوہ کی ایک اور چیخ سُنائی دی اور اِس کے بعد ریسیور کے گِرنے کی آواز آئی۔ دوسرے ہی لمحے گھبرائی ہوئی آواز میں محمد اسلم بولا۔

"مسٹر جاوید، بیگم صاحبہ کو دِل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ میں اُنہیں ہسپتال لیے جاتا ہوں۔ "

جاوید کے دِل کو دھکّا سا لگا۔ چند ثانیے وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

"کیا ہوا؟ چلو نا۔ دیر کیوں کر رہے ہو؟ " پرویز نے کہا۔

"چلو۔ " جاوید نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

تینوں پھاٹک کی طرف چل دیے۔ جاوید نے اُنہیں بیوہ کی بے ہوشی کے سوا فون پر ہونے والی ساری بات بتا دی۔ پھاٹک پر وہ ایک لمحہ کے لیے رُک گئے۔ اِس موقع پر مجید نے جاوید سے کہا۔

"تمہیں مُمانی کو یہ بات نہیں بتانی چاہیے تھی کہ خرگوش سے ہیرے نکلے

ہیں۔"

"وہ خرگوش اور گلہری جو مانگ رہی تھیں۔" یہ کہہ کر جاوید کو اپنی غَلطی کا احساس ہوا۔ اُس نے کہا۔ "دراصل اِس سے پہلے میں یہ کہہ چکا تھا کہ ہم نے اُنہیں اُدھیڑ ڈالا ہے۔ اُنھوں نے اُس کے جواب میں کُچھ اس طرح یہ کہا کہ کیا نکلا کہ بات مُنہ سے نکل گئی۔ پھر بھی کاغذوں کی بات میں نے نہیں بتائی۔"

"اچھّا، یہ بٹن تو لگا لو۔ کہیں کاغذ گر نہ جائیں۔ ہیرے تو ٹھیک سے رکھے ہیں نا؟" پرویز نے کہا۔

عین اُسی لمحے جاوید کو محسوس ہوا کہ باہر پھاٹک سے لگا ہوا کوئی اُن کی بات سُن رہا ہے۔ لیکن قبل اِس کے کہ وہ دروازہ کھول کر اُسے دیکھتا، باہر والے شخص نے گنڈا کھڑکھڑایا۔

"کیا بات ہے؟" دروازہ کھول کر جاوید نے پوچھا۔

اُس شخص نے مُسکراتے ہوئے انگلی اُٹھا کر بغلی نُکّڑ کی طرف اشارہ کیا۔

جاوید نے پلٹ کر دیکھا۔ دس بارہ قدم کے فاصلے پر پولیس کا ایک سب انسپکٹر کھڑا تھا۔ برابر میں ایک خالی ٹیکسی کھڑی تھی۔ وہ بڑی بے فکری کے ساتھ پتلون کی جیب سے چاکلیٹ نکال نکال کر کھا رہا تھا۔ جاوید پر اُس کی نگاہ پڑی تو وہ اُس کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

"آپ اظہر قریشی کے صاحب زادے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔ فرمائیے؟" جاوید بولا۔

"میں لالوکھیت کے تھانے میں تعینات ہوں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "ہمارے ایس ایچ او کے پاس آپ کے والد کا فون آیا ہے۔ وہ لانڈھی کی کسی دوا ساز فیکٹری میں ہیں۔ آپ لوگوں کو بُلایا ہے۔"

”یہ ٹیکسی آپ کے ساتھ ہے؟“ پرویز نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ "

”یہ تو بڑی اچھّی بات ہوئی۔“ جاوید نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ تینوں لڑکے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جس شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا اُس نے ڈرائیور کی سیٹ سنبھالی۔ انسپکٹر اُس کے برابر بیٹھا۔ ٹیکسی چل دی۔ انسپکٹر اب بھی چاکلیٹ کھائے چلا جا رہا تھا۔ اِس بات پر تینوں لڑکے ایک دوسرے کو ٹوکے دے دے کے مُسکرانے لگے۔ جاوید کو اُس کی آواز، لمبوترا چہرہ، چشمہ اور جسم مانوس سا معلوم ہو رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس شخص کو کہیں دیکھا ہے۔ کہاں اور کب؟ یہ بات یاد نہیں آ رہی تھی۔

مجید اُس کے چاکلیٹ کھانے کی نقل اُتارنے لگا۔ اتّفاق سے اُس نے دیکھ لیا۔ مُسکراتے ہوئے اُس نے تین چاکلیٹ اُن کی طرف بڑھا دیے جو اُنھوں نے لے لیے اور ایک ایک چاکلیٹ تینوں نے اپنے مُنہ میں رکھ

لیا۔ اِس وقت اُن کی ٹیکسی کریم آباد کے پُل پر چڑھ رہی تھی۔ چاکلیٹ کا عرق حلق سے اُترتے ہی تینوں کی عجیب حالت ہو گئی۔ کسی نے خود کو آسمان کی جانب اُٹھتا پایا کسی نے خود کو زمین کی اتھاہ گہرائیوں اور تاریکیوں میں ڈوبتا محسوس کیا اور کوئی خود کو فضا میں چکّر کھاتا دیکھنے لگا۔ اِس کے بعد کسی کو کُچھ ہوش نہ رہا۔ یہ صُبح کے تقریباً نو بجے کا واقعہ ہے۔

خاتمہ

رات کے نو بجے کے قریب جاوید اور پرویز خود کو کسمساتا محسوس کر رہے تھے۔ اُنہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے تھک کر چور ہونے کے بعد وہ گہری نیند لے کر بیدار ہو رہے ہوں۔ انگڑائیاں اور جمائیاں لیتے ہوئے وہ اُٹھ بیٹھے۔ اُس وقت اپنے کمرے میں بستروں پر تھے۔ اُنہوں نے اُٹھ کر ہاتھ مُنہ دھوئے لیکن سُستی اتنی تھی کہ ناشتے کی میز پر جانے کے بجائے پھر چارپائیوں پر دراز ہو گئے۔

”شاباش چندا بیٹے؟“ امّی نے دروازے پر رُک کر پیار سے کہا۔ اُن کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی جس میں دو پیالے اور ڈبل روٹی رکھی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے بڑے میز پر رکھ دی اور اُسے چارپائیوں کے درمیان کھسکاتے ہوئے بولیں۔ ”کُچھ کھالو۔“

پیالوں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ دونوں آٹھ کر میز کے سامنے بیٹھ گئے۔ دودھ میں ڈبل روٹی بھگو بھگو کر کھانے لگے۔ کمرے میں ناشتا آنا اور انّی کا اِس طرح پیار سے کھلانا ساری باتیں روزمرّہ کے اُلٹ تھیں مگر اُنھوں نے کسی بات کا نوٹس نہ لیا۔ ڈبل روٹی ختم کر کے وہ دُودھ کی چسکیاں لینے لگے۔ اُس وقت سب سے پہلی بات جو اُنھیں عجیب محسوس ہوئی وہ کمرے میں ہونے والی روشنی تھی۔

”امّی۔ یہ بتّی ابھی تک کیوں جل رہی ہے؟“ پرویز نے کہا۔

”اِس لیے کہ صُبح نہیں ہوئی ہے۔“ امّی نے ہنستے ہوئے کہا۔

دونوں لڑکوں نے چونک کر چاروں طرف غور سے دیکھا۔ بلب کی چمکتی ہوئی روشنی سے اُنہیں اندازہ ہو گیا کہ اِس وقت رات ہے۔ اب اُن کا ذہن تیزی کے ساتھ کام کرنے لگا۔

"ارے، ہم تو ٹیکسی میں جا رہے تھے۔ یہاں کیسے پہنچ گئے؟" پرویز نے جاوید سے کہا۔

"ہاں، اور اُس وقت تو صُبح تھی۔ رات کیسے ہو گئی؟"

اُسی لمحے ڈرائنگ روم سے ڈیڈی کی آواز آئی۔ "بھئی زیب النساء۔ لڑکے اُٹھ گئے ہوں تو بھیجو۔ اُن کے چچا خان آئے ہیں۔"

"اچھّا۔ آ رہے ہیں۔" امّی نے جواب دیا۔ لڑکے اُٹھ کر ڈرائنگ روم کی طرف چل دیے۔ اب اُنہیں تمام باتیں تیزی کے ساتھ یاد آتی جا رہی تھیں۔ چچا خان نے اُنہیں دیکھتے ہی پیار سے چمٹا لیا۔ اظہر قریشی اُنہیں فخر

اور محبّت کے ساتھ دیکھتے رہے۔ چچا خان سے سلام دُعا اور مزاج پُرسی کے بعد دونوں سامنے کے ایک صوفے پر بیٹھ گئے اور گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہی وہ سمجھ گئے کہ وہ پورے بارہ گھنٹے بے ہوش رہے ہیں۔

"ڈیڈی، زُبیری صاحب کے یہاں سے آواز ہیم ریڈیو پر کیوں سُنائی دے رہی تھی؟" جاوید نے پوچھا۔

"تم نے کیا باتیں سُنی تھیں۔" ڈیڈی نے مُسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے اُن سے شاید کُتّے کے بارے میں پوچھا تھا۔" جاوید نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ اور اُنھوں نے بتایا تھا کہ اِس سے وہ بہت محبّت کرتے تھے۔ جب وہ مر گیا تو وہیں لندن میں ایک کاریگر سے اُنھوں نے اُس کی کھال بھروائی۔ چند ماہ پہلے جب وہ کراچی آئے تھے تو سامان رکھتے اُٹھاتے وقت اُس کے اوپر کوئی وزنی چیز گر پڑی تھی۔ اِس سے اُس کی کمر اور پچھلی ٹانگیں کُچھ پچک گئی تھیں۔ یہ عیب اُنھوں نے الیاس شیخ سے

ٹھیک کرایا تھا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں بالکل ٹھیک۔" قریشی صاحب کہنے لگے۔ "تمہاری اِطّلاع پر میں سمجھ گیا تھا کہ زُبیری کے کمرے میں کوئی بگ یا بجلی کا کان چھُپا ہوا ہے۔ چنانچہ ریڈیو کے ماہروں نے حساس آلوں کی مدد سے کمرے کی تلاشی لی تو آخرکار بٹن جیسی اور ہلکے بادامی رنگ کی ایک چیز کھڑکی کی چوکھٹ پر چپکی پائی گئی۔ یہ حصّہ پودے کی جھالر سے چھُپا رہتا تھا۔"

"اچھا۔ خُدائی فوج دار اِسی کی مدد سے زُبیری صاحب کے راز معلوم کرتا تھا۔" پرویز نے کہا۔

"نہیں۔ زُبیری کے راز کئی مہینے سے غائب ہو رہے تھے اور یہ بگ گزشتہ رات لگایا گیا تھا۔"

"یہ آپ کیسے کہتے ہیں؟" پرویز نے پوچھا۔

”اس لیے کہ گزشتہ رات ہی کمرے سے کُتّا چُرایا گیا تھا۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ اس سے پہلے کُتّے کے اندر کوئی بگ چھُپا ہوا تھا؟“ جاوید نے کہا۔

”ہاں۔ بالکل یہی بات ہے۔ الیاس شیخ نے اُس کے اندر بگ چھپا دیا تھا۔ وہ آسمانی سرکس کا ایک کارندہ تھا۔ آرائش کی مختلف چیزوں، خاص طور پر بھُس بھرے جانوروں میں بگ چھپانا اُس کا کام تھا۔ اِس قسم کے جانوروں کو کارخانے داروں، تاجروں اور سرکاری افسروں کے کمروں میں رکھنا اور اُن کے ذریعے راز چُرا کر اُن لوگوں کو دھمکانا آسمانی سرکس کے شیر کی ذمّہ داری تھی اور اُن لوگوں سے ضرورت کے مطابق روپیہ اور کام لینا، پروپیگنڈہ اور افواہوں کے ذریعے ملک میں خانہ جنگی کی فضا تیّار کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ آسمانی سرکس کے گوریلے کے فرائض تھے۔“

”یہ شیر اور گوریلے ہیں کون؟“ پرویز نے سوال کیا۔

"شیر تو ہے خدائی فوج دار۔ وہ شخص جس نے بُھس بھرے جانور چرائے اور جو پولیس انسپکٹر کے بہروپ میں تمہیں ٹیکسی میں بٹھا کر لیے جا رہا تھا۔ اور گوریلا وہی مشکور اینڈ مشکور کمپنی کا مالک ہے جس کی کار میں الیاس منزل سے جانور چرائے گئے تھے۔ وہ شابُو جیسے نہ جانے کتنے لوگوں سے عوام کے مذہبی جذبات بھڑکانے کا کام لیتا تھا اور جس کے دفتر میں رِنگ ماسٹر کی ہدایت کے مطابق خطرناک پمفلٹ چھاپے جاتے تھے۔"

"مگر۔" جاوید نے سوچتے ہوئے کہا۔ "بغیر ٹھوس ثبوت کے یہ ساری باتیں اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہی جا سکتی ہیں؟"

"ہمیں ضرورت سے زیادہ ثبوت حاصل ہو چکے ہیں۔" قریشی صاحب نے کہا۔ "شیر اور گوریلا کے خُفیہ اڈّوں سے ہم غیر قانونی ہیم ریڈیو سیٹ اور جانوروں کی آوازوں والے ٹیپ برآمد کر چُکے ہیں۔ اٹھارہ آدمی ہماری حراست میں ہیں اور اُن میں سے چند ایک ہمیں اہم باتیں بتا چکے ہیں۔"

"شیر اور گوریلا بھی گرفتار کر لیے گئے ہیں؟" پرویز نے پوچھا۔

"ہاں، شابُو اور اُس کے سات ساتھی تو ہم نے کل شام ہی گرفتار کر لیے تھے۔ دوسرے آج دو گھنٹے پہلے پکڑے ہیں۔ اِس سِلسلے میں ہمیں الیاس کے چھپائے ہوئے کاغذوں سے بڑی مدد ملی ہے۔"

اُسی لمحے اچانک جاوید کو ہیرے اور کاغذات یاد آئے۔ وہ گھبرا کر اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ قریشی صاحب نے ایک زور دار قہقہہ لگایا۔ "اچھّا، یہ چیزیں آپ کو اب یاد آ رہی ہیں۔" جاوید شرمندہ سا ہو گیا۔

"یہ چیزیں ہمیں مل چکی ہیں۔ کاغذات آدھے جل چکے تھے پھر بھی خُفیہ گروہ کے ارکان اور اُن کے کرتوتوں کے بارے میں کُچھ باتیں اور ہیروں اور اُن کاغذات کو خرگوش کے اندر چھپانے کا سبب ہمیں اُنہیں سے معلوم ہوا ہے۔"

"کاغذات کسی نے جلائے؟" جاوید نے پوچھا۔

"یہ بات تمہیں چچا خان بتائیں گے۔" قریشی صاحب نے جواب دیا۔ "میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اِن کاغذات میں ایک تو وہ خُفیہ خط تھا جو مارشل لا لگتے ہی ہمارے ایک دُشمن ملک نے اپنے ایجنٹوں کے پاس بھیجا تھا اور باقی دو کاغذات الیاس شیخ کے لکھے ہوتے ہیں۔ ان میں اپنا جُرم ماننے کے ساتھ آسمانی سرکس کے قیمتی راز بھی ظاہر کیے گئے ہیں۔ الیاس دُشمن کا ایجنٹ تھا اور آسمانی سرکس کے ساتھ تعاون کر رہا تھا۔ دُشمن کے ایجنٹوں کے اِس نئے گروہ کا مقصد پاکستان کی سیاسی جماعتوں کی مُخالفت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر مُلک کو بدامنی یا خانہ جنگی میں مُبتلا کرنا رہا ہے۔ یہ سِلسِلہ کامیابی کے ساتھ جاری تھا کہ آسمانی سرکس کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ الیاس شیخ نے ایک انگریز اسمگلر کے قیمتی ہیرے غائب کر دیے ہیں۔ وہ الیاس کو یہ ہیرے گروہ کے حوالے کرنے پر مجبور کرنے لگا۔ الیاس کو یہ بات بُری

معلوم ہوئی۔ گروہ سے اُس کی سخت تکرار ہو گئی۔ اُسے اندیشہ ہو گیا تھا کہ گروہ اب اُس کے ساتھ سختی سے پیش آئے گا۔ ہیروں کو اُس کے ہاتھ سے محفوظ رکھنے اور اُس سے انتقام لینے کی غرض سے اُس نے ایک غیر مُلکی کاریگر کے بنائے ہوئے خرگوش کا انتخاب کیا اور آسمانی سرکس کے بارے میں ساری باتیں لکھ کر ہیروں کے ساتھ اُس میں چھپا دیں۔ آخر گروہ کے لوگوں نے اُسے قتل کر دیا۔ الیاس نے اپنی خُودکُشی کے بارے میں جو تحریر چھوڑی تھی وہ جعلی تھی اور گروہ کے کسی آدمی نے اُسے اِس خوب صورتی سے لکھا کہ وہ ہو بہو الیاس کی تحریر معلوم ہوتی تھی۔ "

"اچھّا تو گوشت اور خون سے اُن کا مطلب ہیرے اور کاغذات ہوتا تھا۔" پرویز نے کہا۔ "اب سمجھ میں آیا الیاس شیخ نے خودکشی نہیں کی تھی بلکہ اُسے قتل کیا گیا تھا۔"

"میرا شروع ہی سے یہی خیال تھا۔" جاوید نے کہا اور پھر چچا خان سے بولا۔

"چچا اب آپ بتا ئیے کہ کاغذات کیسے جلے اور ہم بے ہوش کیسے ہو گئے ؟"

"پہلے یہ بتاؤ۔ "چچا خان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ٹیکسی میں تم نے کُچھ کھایا پیا تھا یا کوئی سوئی وغیرہ چُبھتی محسوس کی تھی ؟"

"ہم نے چاکلیٹ کھائے تھے۔ "پرویز نے کہا۔

"تمہاری بے ہوشی کا یہی سبب تھا۔ چاکلیٹ میں کوئی نشے کی چیز شامل تھی۔ خیر کیا تمہیں یاد ہے کہ پُل پر تمہاری ٹیکسی کے پیچھے ایک چائے کمپنی کی بند کار تھی ؟ "چچا خان نے پوچھا۔

"ہاں یاد پڑتا ہے۔ جھلک سی دیکھی تھی۔ "جاوید نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اُس گاڑی میں چار سپاہیوں کے ساتھ میں خود اُس بدمعاش کی نگرانی کر رہا تھا۔ "چچا خان نے کہنا شروع کیا۔ "رات ہمیں شابُو سے معلوم ہو چکا تھا کہ یہی شخص بُھس بھرے جانوروں کی چوری اور ڈاکے کا ذمّہ دار ہے۔ اس

کی پندرہ سولہ ٹیکسیاں چلتی ہیں۔ نام بھی شیر خان ہے۔ چُن چُن کے نقب زنوں، خُونیوں اور بد معاشوں کو وہ اپنا ڈرائیور رکھتا ہے۔ صُبح پہلے وہ زیبا مینشن گیا اور وہاں سے تمہاری طرف آیا۔ پولیس کی وردی اُس نے زیبا مینشن سے واپس ہوتے ہوئے راستے میں پہنی تھی۔ پہلے اُن کا پروگرام یہ تھا کہ ڈرائیور تمہارے گھر میں داخل ہو کر خرگوش اور گلہری لے بھاگے گا اور شور ہونے پر شیر خاں پولیس کی وردی میں سامنے آ کر جانوروں کو اور تُم میں سے کسی کو ساتھ لے کر چل دے گا۔ یہ بات مُجھے گرفتار ہونے والے ڈرائیور نے بتائی، مگر چونکہ تم لوگوں کی باتوں سے اُسے یہ پتا چل گیا تھا کہ ہیرے اور کاغذات تمہارے پاس ہیں۔ ساتھ ہی اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ تمہارے ڈیڈی زبیری کے پاس گئے ہوئے ہیں اِس لیے تُم سے دوسری بات کی گئی۔ خیر پُل پر تُم کو دیکھ کر میں جوش میں آ گیا۔ گاڑی کے ڈرائیور کو میں نے ہدایت کی کہ ٹیکسی کے پیچھے چلتا رہے۔ شیر خان کو اُس

پر شُبہ ہو گیا۔ اپنے راستے پر جانے کے بجائے دس نمبر لالو کھیت کے چوراہے سے اُس نے ٹیکسی کو بائیں جانب موڑنے کا حُکم دیا۔ اُس راستے پر آگے چل کر ریل کا پھاٹک آتا ہے۔ جب میری گاڑی بھی اُس کے پیچھے ہولی اور تُم لوگ پوری طرح بے ہوش ہو گئے تو اُس نے تمہاری جیبوں سے کاغذات اور ہیرے نکال لیے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ شیر خاں کی مُٹّھی کھڑکی سے باہر ہے اور کاغذات میں آگ لگ رہی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اتنے اہم ہیں کہ گرفتار ہونے سے پہلے شیر خان اُنہیں جلا دینا چاہتا ہے۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے شیر خان کی مُٹّھی پر گولی چلا دی۔ نشانہ ٹھیک بیٹھا۔ کاغذات زمین پر آ رہے۔ گاڑی سے کُود کر میں نے اُن کی آگ بجھائی۔ شیر خان کی ٹیکسی بھی رُک گئی۔ اس کی جانب سے مُجھ پر دو گولیاں چلیں لیکن اُس کا دایاں ہاتھ میری پہلی گوئی سے بیکار ہو چکا تھا۔ بائیں ہاتھ سے نشانہ صحیح نہیں پڑ رہا تھا۔ کاغذات اُٹھا کر میں اُس کی

طرف متوجّہ ہوا۔ میرے سپاہیوں نے دُور دُور پھیل کر اُسے گھیرے میں لے لیا تھا۔ میں نے اُس پر پے در پے دو فائر کیے۔ ایک گولی اُس کا سر چھوتی ہوئی نکل گئی مگر دوسری سینے میں لگی اور وہ گر پڑا۔ اُس کے ڈرائیور کو گرفتار کر لیا گیا۔ شیر خان کو لے کر میں ہسپتال پہنچا۔ دوپہر کے بعد تم لوگوں کو تو ڈاکٹر نے گھر لے جانے کی اجازت دے دی مگر شیر خان کی حالت نازک ہے۔ اب تک ہوش نہیں آیا۔ شاید بے ہوشی ہی میں مر جائے۔“

”اور مجید کہاں گیا؟“ پرویز نے پوچھا۔

”اُسے گھر پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ بھی اب تک ٹھیک ہو چکا ہو گا۔“ چچا خان نے کہا اور پھر چونکتے ہوئے بولے۔ ”تم شاید اِس بات پر حیران ہو کہ مُجھے اُس کا گھر کیسے معلوم ہوا۔ قصّہ یہ ہے کہ شیر خان کی شناخت کے لیے شابُو کو ہسپتال میں بلایا گیا تھا۔ جب اس کو ساتھ لے کر میں تمہارے پاس آیا تو

اُس نے تم تینوں کو بھی پہچان لیا۔ مجید کا گھر اُسی نے بتایا تھا۔"

"ارے ہاں۔" چچا خان نے اس طرح کہا جیسے اچانک کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ "وہ بے چاری الیاس کی بیوہ مر گئی۔ ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔"

کمرے میں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ کُچھ دیر بعد جاوید نے سوال کیا۔ "اور رِنگ ماسٹر کا کیا ہوا ہے؟"

"اتّفاق سے وہ بھی گرفتار کیا جا چکا ہے۔" قریشی صاحب نے کہا۔ "اُس کا ٹھکانا الیاس کے کاغذات میں ہے اور نہ ہی گرفتار شدہ لوگ کُچھ جانتے ہیں۔ ممکن ہے شیر خان کو معلوم ہو مگر شکور لاعلمی ظاہر کرتا ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ وہ کراچی سے باہر ہو گا، لاہور یا مشرقی پاکستان۔ لیکن وہ حضرت بھی یہیں کراچی ہی میں تشریف رکھتے تھے۔ میں ایک مدّت سے شہر کے ایک ریڈیو اور ٹیلیویژن کے تاجر کی نگرانی کر رہا تھا۔ ایک دوست ملک کے ذریعے اطلاع ملی تھی کہ یہ حضرت سنگا پور، ہانگ کانگ اور ٹوکیو

میں ایک جاسوسی سازشی ادارے کے بعض لوگوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔

چند دِن پہلے مُجھے یہ پتا چلا تھا کہ صُبح، دوپہر اور شام کو یہ صاحب اپنے دفتر کے ایک کیبن میں آرام کیا کرتے ہیں اور اس کیبن کے اندران کے سوا کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں۔ کل رات کسی نہ کسی طرح میں اُس کیبن کے دروازے کی پچھلی جھری میں ایک بگ رکھوانے میں کامیاب ہو گیا۔ تمہارے ٹیلیفون کے تھوڑی دیر بعد میرے نائب نے بھی مُجھے اِطّلاع دی کہ کہ اُس بگ کے ٹرانسمیٹر پر زُبیری کی اور میری بات سُنی گئی۔ اس اِطّلاع پر ہم نے اُس دُکان پر چھاپا مارا۔ ایک خُفیہ ہیم ریڈیو کے علاوہ ہمیں وہاں سے آسمانی سرکس کی آوازوں کے ٹیپ بھی مل گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد رِنگ ماسٹر صاحب ہوائی اڈّے سے گرفتار ہو گئے۔ خطرے کی بُو پا کر وہ ایک غیر ملکی طیارے میں فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔"

”پھر تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ آسمانی سرکس ختم ہو گیا۔ اب مُلک کو اِس گروہ سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔“ جاوید نے کہا۔

”ہاں۔“ قُریشی صاحب نے جواب میں کہا۔ ”رِنگ ماسٹر، شیر اور گوریلے کے علاوہ ہم اِس گروہ کے پندرہ دوسرے کارکن گرفتار کر چُکے ہیں۔ باقی لوگ بھی جلد ہی گرفتار ہو جائیں گے۔ اِس طرح خانہ جنگی اور بدامنی کا جو منصوبہ یہ گروہ بنا رہا تھا فی الحال وہ ناکام ہو رہا ہے۔ تاہم خطرے کو اب بھی سوفی صد ختم نہ تصوّر کرنا چاہیے۔ ہمیں ہر وقت چوکنّا رہنا ہو گا۔“

”کیوں؟“ جاوید نے بے صبری کے ساتھ کہا۔ ”کیا مُلک میں دُشمن کے ایجنٹوں کا کوئی دوسرا گروہ بھی موجود ہے؟“

”بھئی کسی دوسرے گروہ کی موجودگی کے بارے میں تو ہمیں ابھی کوئی خبر نہیں۔ لیکن دو باتیں ہمیں اب بھی احتیاط پر مجبور کرتی ہیں۔ ایک یہ کہ آسمانی سرکس اپنے ہتھکنڈوں کے ذریعے ملک میں جو جنونی فضا پیدا کر چکا

ہے اُسے ختم ہونے میں کُچھ عرصہ لگے گا۔ اس درمیان میں بعض سیاسی جماعتوں کے درمیان ہونے والا کوئی بھی ٹکراؤ حالات کو خواب کر سکتا ہے۔ دوسری بات جو ہم سے احتیاط کا تقاضا کرتی ہے یہ ہے کہ جس دُشمن ملک نے آسمانی سرکس کے ذریعے پاکستان میں گڑبڑ پھیلانے کی کوشش کی ہے وہ اِس گروہ کے خاتمے کے بعد کوئی دوسرا گروہ تیّار کرے گا۔"

"پھر تو ہمیں آسمانی سرکس کے خاتمے پر خوش نہیں ہونا چاہیے۔" جاوید نے کہا۔

"اس پر قُریشی صاحب نے ایک زور دار قہقہہ لگایا اور کہنے لگے۔ "نہیں بھئی، یہ بات نہیں۔ آسمانی سرکس کا خاتمہ اتنا معمولی واقعہ نہیں کہ آیندہ کے اندیشوں کی وجہ سے اِس کی خوشی نہ کی جائے۔ دُشمن کو اِس سے زبردست نقصان پہنچا ہے۔ اور تمھیں اِس بات پر فخر کرنا چاہیے کہ اس

گروہ کو انجام تک پہنچانے میں تُم نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ میرا مطلب صِرف یہ ہے کہ اِس کامیابی کے بعد بھی تمہیں حالات پر گہری نظر رکھنی چاہیے۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔" جاوید نے جوش کے ساتھ کہا۔

"شاباش! مُجھے تُم سے ایسی ہی اُمّید ہے۔"

"اور ڈیڈی!" پرویز نے کُچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "وہ ہیرے کِسے ملیں گے؟"

ڈیڈی نے چونکتے ہوئے کہا۔ "اوہ۔ وہ قومی خزانے میں جمع ہو جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کسی بھی طرح وہ پچاس لاکھ روپے سے کم قیمت کے نہ ہوں گے۔"

"پچاس لاکھ روپے؟ جاوید کا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں۔ ممکن ہے اِس سے زیادہ کے ہوں۔" قریشی صاحب نے جواب دیا اور پھر کُچھ سوچتے ہوئے بولے بھلا سب سے پہلے یہ خیال کِسے آیا تھا کہ الیاس نے کہیں کوئی دولت چھپا رکھی ہے۔"

"یہ بات ہم سے مجید نے کی تھی۔" جاوید نے کہا۔

"اچھّا۔ اور سب سے پہلے یہ شک کِسے ہوا تھا کہ وہ دولت خرگوش میں چھپی ہوئی ہے؟" ڈیڈی نے دوسرا سوال کیا۔

"مجید کو۔" پرویز بولا۔

"یہ تم نے خُوب بتایا۔ اب میں اپنی رپورٹ میں بھی یہی لکھوں گا۔ مُجھے اُمّید ہے کہ حکومت کی جانب سے مجید کو انعام دیا جائے گا۔"

اور واقعی اظہر قریشی صاحب کا یہ خیال ٹھیک نکلا۔ چند ہی ہفتے بعد عدالت

کی جانب سے آسمانی سرکس کے رِنگ ماسٹر اور گوریلے کو چودہ چودہ سال کی (شیر ہسپتال میں مرچکا تھا) شابُو اور گروہ کے دوسرے کارندوں کو دس سے لے کر سات سال تک کی سزائیں دی گئیں۔ اظہر قریشی صاحب کی مدّت ملازمت میں ایک سال کی توسیع کے ساتھ ساتھ اُنہیں اور اُن کے بیٹوں کو شاباشی کا سرٹیفکیٹ دیا گیا اور مجید کو حکومت کی جانب سے بیس ہزار روپے بطورِ انعام دیے گیے۔

ختم شُد